مسلم تعلیمِ نسواں کے سو سال

چلمن سے چاند تک

مسلم تعلیمِ نسواں کے سو سال

چلمن سے چاند تک

ڈاکٹر راحت ابرار

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

Muslim Taleem-e-Niswan ke Sau Saal

Chilman Se Chand Tak

by

Dr. Rahat Abrar

Year of 1st Edition 2011
ISBN 978-81-8223-787-2
Price Rs. 200/-

نام کتاب	:	مسلم تعلیمِ نسواں کے سو سال: چلمن سے چاند تک
مصنف	:	ڈاکٹر راحت ابرار
سن اشاعت اوّل	:	۲۰۱۱ء
قیمت	:	۲۰۰ روپے
مطبع	:	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

اپنے بیٹے

طلحہ اسرار

اور بیٹی

صوبیہ راحت

کے نام

جنہوں نے عبداللہ نرسری سے اپنا تعلیمی سفر شروع کیا

فہرست

☆☆

حرفِ آغاز

کسی بھی ملک کے شہریوں کی علمی، ادبی، فنّی، سیاسی، تمدنی اور اخلاقی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے مردوں کے علاوہ عورتوں کے حالات سے واقفیت بھی بہت ضروری ہے۔ ہندوستان نے زراعت اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے میدان میں خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلی ہو مگر تعلیم اور خاص طور سے عورتوں کی تعلیم کے میدان میں ہمارا ملک آج بھی انتہائی پسماندہ ملک تسلیم کیا جاتا ہے۔

اکیسویں صدی حقوقِ انسانی کی صدی ہے۔ پوری مہذب دنیا کے لوگ اپنے حقوق کے تئیں بیدار ہو رہے ہیں۔ حصول علم کو بنیادی حق کا درجہ دیا جا رہا ہے۔ انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے رضا کارانہ تنظیمیں بھی سرگرمِ عمل ہیں۔

خواتین کو عطائے اختیار کے حوالے سے متعدد رضا کارانہ تنظیموں اور حکومتوں نے خواتین کی پسماندگی، معاشرے میں ان کے جائز حقوق اور ان پر ہونے والے جبر و استحصال کو ایک عالمگیر مسئلہ کے طور پر دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ آج کی عورت اپنے ماضی کی تاریخ پر برافروختہ ہے اور اپنے وجود کی اہمیت کو تسلیم کرانے کے لئے جدوجہد کر رہی ہے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ مشرقی و مغربی تمدن کا تصادم شروع ہوا۔ فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ پرانی قدریں ایک ایک کر کے مٹنے لگیں، نئی قدریں جڑ پکڑنے لگیں، نئے علوم وفنون کی مانگ بڑھتی گئی، پرانے علم وفن کی قدر و قیمت گھٹتی گئی، نئی تعلیم پھیلی، مغربی تہذیب وتمدن کی چمک دمک سے مشرق کی آنکھیں کھلیں اور بجلی کے قمقموں کے سامنے مٹی کے دیئے مانند پڑ گئے۔ غرض پرانا سماجی نظام اور پرانا تعلیمی ڈھانچہ سب بے جان نظر آنے لگا۔

1857ء کے انقلاب نے نہ صرف مسلمانوں کو ذہنی طور پر متاثر کیا بلکہ ہندوؤں میں بھی جاگرتی کی لہر دوڑی۔ نئی نئی تحریکات نے جنم لیا۔ ہندوؤں کے روشن خیال طبقے کی طرف سے برہمو سماج، پرارتھنا سماج، آریہ سماج، جیوتے باپھلے اور مہارشی کردے جیسے لیڈروں کے زیرِ اثر نئی تعلیم کی مانگ بڑھتی جارہی تھی اور زنانہ اسکول کھلتے جارہے تھے۔

مسلمانوں کو جب یہ پتہ چلا کہ سرکاری اسکولوں میں انگریزی تعلیم کا بندوبست ہوگا تو آٹھ ہزار علماءؑ کے دستخطوں سے گورنر جنرل کو ایک میمورنڈم کے ذریعہ انگریزی تعلیم کی مخالفت کی گئی۔ اس صورتِ حال نے مسلمانوں کو دو طبقوں میں منقسم کردیا۔ ایک طبقہ مذہبی عقائد سے زیادہ سیاسی وجوہات کی بناءٔ پر مغرب کے نئے اثرات سے متنفر تھا اور اپنی روایتوں کا امین تھا تو دوسرا طبقہ ذہنوں کے فرسودہ نقشِ کہن کو ہٹا کر دل و دماغ میں نئے افکار و نظریات کی قندیل روشن کرنا چاہتا تھا۔ اس نئے طبقے کے نمائندے سرسید احمد خاں تھے جو ہر چیز کو عقل و استدلال کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔ وہ مذہب اور سائنس میں مطابقت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ سے بھی واقف تھے کہ ایک زمانے تک اسلام حکمت، سائنس اور روشن خیالی کا سرچشمہ تھا اور جب سے مسلمانوں نے علم و سائنس، شعور و آگہی سے اپنا ناطہ توڑا تبھی سے وہ زوال پذیر ہوتے چلے گئے۔ اس زوال کی سب سے اہم وجہ عورتوں کی تعلیم کو نظر انداز کرنا بھی تھا۔

یہی وہ لمحات تھے جب سرسید کو انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لئے جدید تعلیم کو اپنا ہتھیار بنانا پڑا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کا مشن اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا جب تک کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کی تعلیم و اصلاح اور مذہبی عقائد و رسومات کو درست نہ کیا جائے۔ سائنٹیفک سوسائٹی کے اجلاس میں انہوں نے پہلا لیکچر عقد بیوگان پر دیا۔ سرسید نے تعلیم نسواں کے سلسلہ میں متعدد مضامین اور اداریوں میں اظہار خیال کیا اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے متعدد شمارے اس اجمال کی تفصیل پر گواہ ہیں۔ وہ عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا رفیق کار سمجھتے تھے اور عورت کی تعلیم و تربیت کی کوشش کو مستحسن قرار دیتے تھے۔

خود سرسید کے رفقاءؑ میں ڈپٹی نذیر احمد نے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ماحول سازی کا کام انجام دیا اور عورتوں کے مسائل کو اپنی ناولوں کا موضوع بنایا۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنی

تحریروں میں تعلیمِ نسواں کی پرزور حمایت کی اور اپنی شاعری میں یہ اعلان کیا کہ ''اے ماؤں، بہنوں، بیٹیوں..... دنیا کی عزت تم سے ہے۔'' محسن الملک نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ''بغیر تعلیمِ نسواں کے قومی زندگی مہمل رہے گی۔ مسلمان ہمیشہ اس اعلیٰ اور مہذب نعمت کے الطاف سے محروم رہیں گے جو تعلیم یافتہ عورتوں کی وجہ سے گھر میں ہوتی ہے۔ یہ کون سی انسانیت ہے کہ عورتوں کو تعلیم سے محروم رکھا جائے، ان کو تعلیم نہ دینا ان پر ظلم کرنا ہے۔''

علی گڑھ تحریک سے پہلے اردو شاعرات کے اولین تذکرہ نگار حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی نے 1864ء میں جب عورتوں کی تعلیم کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی تھی، ان کی حیثیت اور مرتبہ پر ظلمت کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور عورتوں کو دنیا کی نگاہ سے اوجھل رکھنا سوسائٹی کے وقار کے لئے ضروری تصور کیا جاتا تھا، اس وقت تذکرہ بہارستانِ ناز تصنیف کیا اور تعلیم نسواں کو اس کی تالیف کا سبب قرار دیا۔ اسی دور میں اردو شاعرات کے تین تذکرے شائع ہوئے۔ پہلا رنج میرٹھی کا جو 1864ء میں پہلی مرتبہ، 1869ء میں دوسری مرتبہ اور 1882ء میں تیسری اور آخری مرتبہ شائع ہوا۔ اس کے بعد درگا پرساد نادر کا ''چمن انداز'' 1878ء میں اور مولوی عبدالحئی صفا بدایونی کا ''شمیم سخن'' 1882ء میں شائع ہوا اور شاعرات کی تعداد بھی 151 تک ہوگئی۔ ان تینوں شاعرات کے تذکرہ نگاروں نے تعلیمِ نسواں کے فروغ کو اپنی تالیفات کا جواز بنایا۔

مسلم خواتین کے شعور کو بیدار کرنے اور انہیں عصرِ حاضر کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اردو صحافت نے بھی کلیدی رول ادا کیا۔ خواتین کے لئے مخصوص رسائل کا اجرا بھی انیسویں صدی کے اواخر سے شروع ہوتا ہے۔ 1880ء میں لکھنؤ سے ''رفیقِ نسواں'' کے نام سے عورتوں کا پہلا رسالہ جاری ہوا۔ 1884ء میں دلّی سے ''اخبار النسا''، 1886ء میں حیدرآباد سے ''معلمِ نسواں''، 1898ء میں لاہور سے ''تہذیب نسواں'' اور 1904ء میں علی گڑھ سے ''خاتون'' رسالہ جاری ہوا جس کے ایڈیٹر سرسید کے تربیت یافتہ شیخ محمد عبداللہ تھے۔

سرسید کی اسی تعلیمی اور ثقافتی تحریک کے اثر سے بہت جلد ہی ایک معقول اور روشن خیال مسلمان حلقہ بن گیا جس نے عام مسلمانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم واصلاح پر بھی خصوصیت کے ساتھ زور دیا۔ سرسید کے عہد میں لڑکیوں کی تعلیم ایک تہذیبی ضرورت تو تھی مگر

اقتصادی ضرورت نہ تھی۔ لڑکیاں گھر میں ہی تعلیم حاصل کر کے اس دور میں مسلم معاشرے کی تہذیبی ضرورت پورا کرتی تھیں۔

سر سید کے قائم کردہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی پہلی نسل جب جدید تعلیم سے پوری طرح تیار ہوگئی تو ان کے سماجی مرتبہ کے لئے تعلیم یافتہ خواتین کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ علی گڑھ کی یہ پہلی نسل آزادیٔ نسواں اور عورتوں کے مساوی حقوق کی وکالت کرتی تھی۔ اسی پہلی نسل کے ایک نوجوان شیخ محمد عبداللہ نے 1906ء میں جب علی گڑھ میں زنانہ مدرسہ شروع کیا تو ان کے ہم جماعت ساتھیوں نے بھرپور تعاون دیا مگر اس وقت تک مسلمانوں کی اکثریت تعلیم نسواں کی مخالف تھی اور شیخ صاحب کو بھی سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں ایم اے او کالج احاطے میں اسکول کھولنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ انگریز پرنسپل مسٹر آرچبولڈ بھی تعلیم نسواں کے اسکول کو لڑکوں کے کالج کی صحت کے لئے مضر خیال کرتے تھے۔ اسی لئے یونیورسٹی علاقہ سے پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر بالائے قلعہ کے ٹن ٹن پاڑہ علاقہ میں یہ اسکول کھولا گیا۔ بعد میں جب حالات سازگار ہوگئے تو میرس روڈ پر اس اسکول کو منتقل کر دیا گیا اور آج برِ صغیر میں مسلم تعلیم نسواں کا یہ سب سے اہم مرکز ہے۔ سو سال پہلے مسلم معلمات کا فقدان تھا اور بعض کورسوں کو مرد استاد چلمن کے پیچھے سے پڑھاتے تھے۔ آج اس ادارے کی طالبات ڈاکٹر ہیں، انجینئر ہیں، وکیل ہیں، سائنسداں ہیں، سیاستداں ہیں، صحافی اور خلائی سائنسداں بھی ہیں۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں اس ادارے کی لڑکیوں نے اپنی موجودگی درج نہ کرائی ہو۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی پسماندگی کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی رہی ہے کہ ہماری مائیں جاہل اور باپ غافل رہے۔ حکومت کی بے توجہی، مسلمانوں کی بے حسی اور مسلم قیادت کی غفلت شعاری بھی ہماری پسماندگی کے اسباب ہیں۔

بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں مسلمانوں میں تعلیمی بیداری کی لہر پیدا ہوئی ہے۔ آج بڑی تعداد میں مسلم گھرانوں کی لڑکیاں گھر کی دہلیز سے باہر نکل کر تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ وہ پڑھنا چاہتی ہیں، خود کفیل ہونا چاہتی ہیں، ان کی ناخواندگی کی وجہ پردہ یا مذہبی پابندیاں نہیں ہیں۔ ان کی سماجی بنیاد کمزور ہے۔ ایران اور ملیشیا کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

وہاں عورتیں تعلیم یافتہ اور برسر روزگار ہیں۔ حیا اور حجاب کے ساتھ باہر نکلتی ہیں، دفتروں میں کام کرتی ہیں، وقار کے ساتھ با مقصد زندگی گزارتی ہیں اور اپنے بچوں کو باخبری کے ماحول میں تربیت دیتی ہیں، دین کی قدروں کو ان کے ذہنوں میں پیوست کر دیتی ہیں کہ بادِ مخالف کا ان پر کوئی اثر ہی نہ ہو۔ ایران کی ہی انوشا انصاری نے دنیا کی پہلی خلائی سیاح ہونے کا درجہ حاصل کرلیا ہے اور وہ آج پوری دنیا کی عورتوں کے لئے رول ماڈل بن گئی ہیں۔ عورت کو تعلیم کی نعمت سے محروم رکھنا اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف ہے اور ہندوستان کے سماجی نظام میں بہت بڑا ظلم ہے۔

آج تعلیم نسواں مسلم سماج کے ایجنڈے میں شامل ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ پہلے علمائے حضرات تعلیم نسواں کے خلاف کفر کے فتوے جاری کرتے تھے مگر آج بڑی تعداد میں لڑکیوں کے دینی مدارس قائم ہو رہے ہیں۔ ان کا نصاب بھی انہی بنیادوں پر تیار کیا جا رہا ہے کہ یہ مسلم خواتین اپنے شرعی حقوق کو تسلیم کرا سکیں۔ ان لڑکیوں کے جامعات میں کمپیوٹر ایجوکیشن کے ساتھ ساتھ پیشہ ورانہ کورس بھی شروع ہو گئے ہیں تاکہ وہ خوش حال زندگی بسر کر سکیں اور ذرائع ابلاغ میں عورتوں کے تعلق سے اسلام پر ہونے والے حملوں کا عالمانہ ڈھنگ سے جواب دے سکیں۔ بڑی تعداد میں لڑکیوں کے عصری علوم کے ادارے بھی قائم ہو رہے ہیں اور مسلمان لڑکوں کے مقابلے میں مسلم لڑکیاں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ روایتی علوم کے ساتھ ساتھ پیشہ ورانہ تعلیم میں بھی مسلم لڑکیوں کے تناسب میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

اس کتاب کی تصنیف کا بنیادی سبب شیخ محمد عبداللہ کی تعلیم نسواں کے تعلق سے خدمات پر انہیں نذرانۂ عقیدت پیش کرنا ہے کیونکہ انہوں نے ایک صدی قبل 1906ء میں لڑکیوں کی تعلیم کا جو بیج بویا تھا وہ آج تناور درخت بن گیا ہے۔

اس کتاب کی تیاری اور مواد کی فراہمی میں جن بزرگوں اور دوستوں نے میری رہنمائی فرمائی ان میں پروفیسر اطہر صدیقی صاحب، مسلم یونیورسٹی کے ڈپٹی لائبریرین مسٹر شکیل احمد، جناب مہر الٰہی اور نظامی پریس کے مالک مولوی نظام الدین حسین کے پڑپوتے عظیم الدین نے میرا قدم قدم پر ساتھ دیا۔

میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر پی کے عبدالعزیز صاحب کا بھی دل

کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس دانش گاہ میں تعلیمی ماحول قائم کر کے یونیورسٹی کارکنان کو تحقیقی اور تصنیفی کام کرنے کے مواقع فراہم کرائے۔

مواد کی فراہمی اور کتاب پر نظرِ ثانی کے لئے اپنے مخلص کرم فرماؤں میں پروفیسر شافع قدوائی اور شعبۂ سیاسیات کے پروفیسر اسمر بیگ کا بھی خصوصی طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اپنے شعبہ کے رفیقِ کار جناب اویس جمال شمسی اور جناب شمس الزماں کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنا وقت نکال کر کمپوزنگ کر کے اس کتاب کو مقررہ وقت میں پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں میری مدد کی۔

(ڈاکٹر راحت ابرار)

☆☆

باب اول

سر سید اور تعلیمِ نسواں

سر سید احمد خاں کی کتابِ زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی زندگی میں دو لمحات ایسے آئے جنہوں نے ان کی فکر و عمل کی نئی راہیں متعین کیں۔

ان کی زندگی کا سب سے پہلا اور اہم واقعہ 1857ء کا انقلاب تھا جسے اس دور میں غدر کا نام دیا گیا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں کا جاہ و جلال ختم ہو گیا اور وہ حسرت و یاس کی تصویر بن کر رہ گئے۔ انگریزوں کا پورے ملک پر تسلط ہو گیا اور مسلمانوں کی تہذیبی شناخت کو ختم کرنے کے لئے سامراجی حکومت کی طرف سے نئے نئے حربے استعمال کئے جانے لگے۔

9 رمئی 1857ء کو جس وقت میرٹھ کی فوج نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کیا اس وقت سر سید بجنور میں تھے اور کچھ ہفتہ بعد بجنور سے میرٹھ آ گئے۔ میرٹھ میں ان کو معلوم ہوا کہ دلّی میں سرکاری فوج کے سپاہیوں نے ان کا گھر اور تمام سامان لوٹ لیا ہے۔ جب دلّی میں سرکاری فوج نے اپنا قبضہ جمانا شروع کیا اور کشمیری دروازہ فتح ہوا تو شہر کی تمام عورتیں اور مرد اپنی جان بچانے کے لئے شہر چھوڑ کر بھاگنے لگے ان میں سر سید کا کنبہ بھی شامل تھا۔ سر سید کے ماموں وحید الدین خاں اور ان کے ماموں زاد بھائی ہاشم علی خاں سپاہیوں کے ہاتھوں ہلاک کردئے گئے۔ (1)

مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر لال قلعہ چھوڑ کر نظام الدین چلے گئے تھے مگر سر سید کی والدہ اور خالہ اپنی پشتینی حویلی چھوڑ کر جلّو خانہ کی ایک کوٹھری میں جہاں زبین نامی ایک لاوارث بڑھیا رہتی تھی چلی آئیں اور آٹھ دن نہایت تکلیف سے اس کوٹھری میں گزارے جو

دراصل گھوڑوں کا اصطبل تھا۔ اس عرصہ میں کسی طرح سرسید بھی دلّی پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ تین دن سے ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا، کسی قدر گھوڑے کا دانہ مل گیا تھا اسی کو کھاتی رہیں۔ دو دن سے پانی بھی ختم ہو چکا تھا اور پیاس کے مارے برا حال تھا۔ سرسید پانی کی تلاش کو نکلے۔ کنوئیں پر کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے پانی نکالا جا سکے اور چاروں طرف کرفیو جیسا منظر تھا۔ وہ سیدھے لال قلعے گئے اور وہاں سے ایک صراحی پانی لے کر چلے۔ جب اس جگہ پہنچے جہاں ان کی ماں اپنی جان بچائے چھپی ہوئی تھیں تو وہیں ایک بڑھیا سڑک پر بیٹھی ہے اور اس کے ہاتھ میں صراحی اور آب خورہ ہے اور وہ کسی قدر بدحواس ہے۔ سرسید نے اسے پانی پلایا اور پھر اپنی والدہ اور خالہ کو پانی دینے چلے گئے۔ لوٹ کر دیکھا کہ وہ عورت مری پڑی ہے۔ کرفیو کے اس عالم میں وہ اپنی والدہ اور خالہ کو لیکر کسی طرح میرٹھ پہنچ گئے۔ گھوڑوں کا راتب کھانے کی وجہ سے ان کی ماں کو بیماری ہو گئی تھی کچھ دن بیمار رہنے کے بعد یکم ربیع الثانی 1274ھ کو میرٹھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (2)

اس سلسلے میں سرسید کے قریبی دوست مولوی سمیع اللہ خاں کے سوانح نگار شمس العلماً خان بہادر مولوی ذکاءُ اللہ مزید روشنی ڈالتے ہیں کہ ”اگرچہ غدر کے پرآشوب زمانے میں سواری کا دستیاب ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا مگر مولوی سمیع اللہ نے تمام بڑے کرایوں پر رتھیں حاصل کیں، ایک میں اپنی مستورات کو سوار کرایا اور ایک رتھ لے کر سرسید کے مکان پر گئے۔ اس میں ان کی بیوی اور تینوں بچوں کو بہ ہزار مشکل سوار کرایا لیکن سید صاحب کی والدہ اور ان کی خالہ نے گھر نہ چھوڑا...... غرض کہ ان رتھوں کو لے کر پا پیادہ نظام الدین اولیاً گئے۔ مولوی صاحب کے اس برتاؤ سے سید احمد خاں صاحب کے دل پر ان کی نسبت گہرا اثر ہوا جس سے بمقابلہ دوسرے عزیزوں کے سید احمد خاں صاحب کا آپ سے زیادہ اتحاد ہو گیا اور ربط بڑھتا گیا۔“ (3)

1857ء کے ہولناک واقعہ کا ذکر سرسید کے سوانح نگار مولانا الطاف حسین حالؔی نے حیاتِ جاوید میں تحریر فرمایا ہے کہ ”دلّی، مرادآباد اور بجنور کے مسلمان خاندانوں کی تباہی سے سرسید کا حال بعینہ اس شخص کا سا تھا جس کے گھر کا ایک حصہ آگ سے جل گیا ہو اور باقی حصوں کو بچانے کے لئے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا پھرتا ہو۔ گورنمنٹ تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے بدگمان ہو گئی تھی۔ مسلمان گورنمنٹ کے شدید انتقام اور سخت سزاؤں سے جو غدر کے بعد ظہور میں

آئیں اس کی مہربانی اور شفقت سے بالکل مایوس ہو گئے تھے۔ حکمراں قوم مسلمانوں کو دشمن کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ انگریزی اخباروں میں برابر مسلمانوں کے خلاف آرٹیکل لکھے جاتے تھے، جن سے انگریزوں کا دل روز بروز مسلمانوں سے زیادہ پھٹتا جاتا تھا۔۔ کچہریاں اور دفاتر مسلمانوں سے خالی ہوتے جاتے تھے، فوج میں ان کی بھرتی کم ہوگئی تھی، وہ درباروں میں کم بلائے جاتے تھے۔ غرض کہ تمام آثار اس بات پر گواہی دیتے تھے کہ اب مسلمانوں کا ہندوستان میں عزت اور اعتبار کے ساتھ رہنا غیر ممکن ہے۔ ان تمام باتوں پر نظر کر کے اول اول تو سرسید کا بھی جی چھوٹ گیا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے کسی دوسرے اسلامی ملک میں جا کر بود و باش اختیار کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا مگر آخر کار ان کو وہ ارادہ فسخ کر کے قوم کی آگ میں کودنا پڑا۔'' (4)

سرسید کہتے ہیں کہ ''غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا۔ جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے اسی غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دئے'' (5)

یہی وہ لمحات تھے جب سرسید کو انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لئے جدید تعلیم کو اپنا ہتھیار بنانا پڑا۔ اگر 1857ء کا غدر نہ ہوتا اور ان کی والدہ کو ان حالات کا مقابلہ نہ کرنا پڑتا تو شاید وہ تعلیم پر توجہ نہ کرتے اور ایک ادیب کی طرح کتابیں تصنیف و تالیف کرتے رہتے اور سرکاری ملازمت میں اپنی خوشحال زندگی بسر کرتے رہتے۔ ان کی والدہ پر جو بیتی تھی، اس نے سرسید کے جسم و جاں کو جھنجھوڑ دیا تھا، روح کو زخمی کر دیا تھا۔

سرسید نے اپنی والدہ عزیز النساءؔ کا حال خود سیرت فریدیہ میں لکھا ہے۔ سرسید کے والد سید محمد متقی ایک صوفی منش انسان تھے اور جب شاہ غلام علی کے مرید ہو گئے تو ان میں گھر سے بے تعلقی پیدا ہو گئی تھی اس لئے سرسید کی تربیت اور ان کے اخلاق و عادات میں ان کی والدہ کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ان میں قدرتی قابلیت معمولی عورتوں سے بہت زیادہ تھی، وہ قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور ابتدا میں کچھ فارسی کی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ سرسید کو اپنی ماں کی آغوش کی تربیت کا لطف زندگی بھر یاد رہا۔ سرسید نے ابتدائی تعلیم اپنی ماں سے ہی حاصل کی تھی۔ ان کے محلے اور

خاندان کی لڑکیاں بھی ان کی والدہ سے پڑھتی تھیں۔

سرسید کا بیان ہے کہ ''جب میں دلّی میں منصف تھا تو میری والدہ کی نصیحت تھی کہ جہاں تم کو ہمیشہ جانا ضروری ہو وہاں کبھی سواری پر جایا کرو اور کبھی پیادہ جایا کرو۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں۔ کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہمیشہ اس کو نباہ سکو۔ چنانچہ میں نے جامع مسجد اور خانقاہ میں جانے کا یہی طریقہ رکھا تھا کہ اکثر پیدل اور کبھی کبھی سواری پر جاتا تھا''

سرسید کہتے تھے کہ جو کچھ آمدنی ہوتی تھی اس میں سے پانچ فیصدی کے حساب سے میری والدہ ہمیشہ الگ رکھتی جاتی تھیں اور اس سرمایہ کو حسن انتظام کے ساتھ نیک کاموں میں صرف کرتی تھیں۔ کئی جوان لڑکیوں کا ان کی امداد سے نکاح ہوا۔ اکثر پردہ نشین عورتیں جو معاش سے تنگ ہوتیں ان کی پوشیدہ خبر گیری کرتیں۔ غریب خاندانوں کی نوجوان لڑکیاں جو بیوہ ہو جاتیں ان کو دوسرے نکاح کی نصیحت کرتیں اور دوسرے نکاح کو برا سمجھنے والوں کو سمجھاتیں، سنتِ رسول کا واسطہ دیتیں، غریب رشتہ داروں کے گھر جاتیں اور خفیہ یا کسی حیلہ سے ان کی مدد کرتیں۔ سرسید نے اپنی والدہ میں انسانی ہمدردی، فیاضی اور اولوالعزمی کے ساتھ مذہبی عقائد کے معاملے میں ان کی روشن خیالی دیکھی تھی۔ وہ روایتی رسم و رواج سے متنفر تھیں اور تعویز گنڈوں، نیاز و نذر پر یقین نہیں رکھتی تھیں۔ (6)

سرسید کی بہن صفیۃ النسأ بیگم عورتوں میں ممتاز اور قابل تھیں۔ اکثر مذہبی کتابیں اور کچھ حدیث کی عربی کتابیں بھی معہ ترجمہ کے پڑھتی تھیں اور ان کے گھر پر کنبے کی اکثر لڑکیاں جمع ہوتیں اور ان سے پڑھتی تھیں۔ (7)

سرسید کی بڑی بہن کا نام خواجہ حالؔی نے صفیۃ النسأ لکھا ہے جب کہ سرسید اپنی تحریروں میں ان کا نام بجیۃ النسأ بیگم تحریر فرماتے ہیں۔ تعلیمِ نسواں کے سلسلے میں اپنی بہن کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا تھا کہ ''میری بہن کا گھر اس کام کے لئے خاص کیا گیا تھا اور ایک گروہ رشتہ دار لڑکیوں کا اس طرح ایک دالان میں پڑھا کرتا تھا اور میری بہن کے شوہر، جو نہایت بزرگ تھے، ان لڑکیوں کی تعلیم میں زیادہ کوشش کرتے تھے۔ میرے نانا کے حقیقی بھائی ہر روز یا ایک دن بیچ کر کے مکتب میں آتے تھے اور فارسی خط جو لڑکی سیکھنا چاہتی تھی اس کو اصلاح دیتے

تھے۔ صبح سے کھانے کے وقت تک پڑھنے کا وقت تھا۔ کھانے کے وقت پر سب لڑکیاں اس گھر کی مالکہ کے ساتھ کھانا کھاتی تھیں۔ کھانے کے بعد ظہر کے وقت تک سینے پرونے یا اسی قسم کے خانہ داری کے کاموں کو سیکھنے میں گزرتا تھا۔ ظہر کے وقت سب لڑکیاں نماز پڑھتی تھیں اور عصر کے وقت تک پھر اپنے پڑھنے میں مصروف رہتی تھیں۔

عصر کے بعد ڈولیوں میں سوار ہوتیں اور اپنے اپنے گھر چلی جاتیں۔ جمعہ کا دن نہایت دلچسپ ہوتا تھا۔ سب لڑکیاں بدستور صبح سے آتی تھیں اور سب مل کر چھوٹی چھوٹی پتیلیوں میں مختلف قسم کے کھانے پکاتی تھیں اور سب لڑکیوں کو انہیں کا پکایا ہوا کھانا کھلاتی تھیں۔ کبھی کبھی اپنے ہم عمر بھائیوں کو بھی وہ لڑکیاں بلاتی تھیں اور کھانا کھلاتی تھیں۔'' (8)

سر سید ایسی ہی تعلیم و تربیت کو مشرقی خاتون کے لئے ضروری خیال کرتے تھے۔ سر سید ہندوستان میں عورتوں کی زبوں حالی اور ان کے ساتھ امتیازی سلوک پر سخت نالاں رہتے۔ 19 ویں صدی کے ہندوستان میں دختر کشی اور بیوہ کے ستی ہونے کی رسم عام تھی نیز کئی کئی شادیاں کرنے کا بھی رواج تھا۔ سر سید نے تعلیم کے حوالے سے اصلاحِ معاشرہ کا بیڑہ اٹھایا تھا اور سب سے پہلے انہوں نے عورتوں سے متعلق فرسودہ رسوم کی بیخ کنی کے لئے آواز بلند کی۔ انہوں نے اپنے ہم وطن بھائیوں کی بھلائی سے متعلق سائنٹیفک سوسائٹی کے انسٹی ٹیوٹ میں 5 / جولائی 1866ء کو ایک لیکچر دیا جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے شمارے مورخہ 13 / جولائی 1866ء کو شائع ہوا۔ یہ لیکچر اردو میں سر سید نے اور انگریزی میں سید محمود نے دیا۔ سر سید نے اپنے اس لیکچر میں عورتوں کے ساتھ مساوی سلوک کرنے اور دختر کشی، بیواؤں کے ستی ہونے اور کثرتِ ازدواج کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے لکھا

''ان بری رسموں میں سے نہایت مشہور بری رسم بیوہ کے ستی ہونے اور بیمار کو دمِ واپسیں دریا کے کنارے لے جا کر زبردستی اس کی جان نکالنے کی رسم تھی اور دختر کشی اور شادیوں میں اصراف ہونا اب بھی موجود ہے۔ ان میں سے دختر کشی کی رسم ایک ایسی بد اور خراب رسم ہے کہ انسان کے دل میں جو اچھے اخلاق کا اثر قبول کرنے کی قابلیت ہے وہ رسم اس کو مغلوب نہیں کرتی اور بد اخلاقی ہی پیدا نہیں کرتی بلکہ مخلوق کی ترقی کی بھی مانع ہے۔ جس کے سبب سے قوم کی

شان و شوکت بڑھ نہیں سکتی۔ ایک بری رسم جس کو مختصر بیان کرتے ہیں بے تعداد جورو ئیں رکھنا ہے جس کا بعض بعض مقامات میں رواج ممکن ہے۔ اس امر میں پند و نصیحت اور کوشش اس قدر کام نہ کرے گی جس قدر اس کے امتناع کا ایک قانون اثر کرے گا اور اس کے لئے پہلے ہی سے گورنمنٹ کے حضور میں عرضی گذاری گئی ہے۔'' (9)

ملک پر برطانیہ کا تسلط قائم ہونے اور مغربی خیالات کی ترویج کے باعث ہندوستانیوں کی توجہ تعلیم کی طرف ہونے لگی تھی اور جگہ جگہ تعلیمی ادارے قائم ہونے لگے تھے۔ عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ پوری شدت کے ساتھ زیرِ بحث آیا تھا اور لوگ اب خواتین کی تعلیم کے حق میں خیال ظاہر کرنے لگے تھے۔ سرسید کے نزدیک یہ صورتِ حال بہت امید افزا تھی۔ انہوں نے اپنے مذکورہ لیکچر میں کہا

''بہت سے ایسے مدرسے اور کالج جن کو ہندوستانی قائم کرتے ہیں بڑے بڑے شہروں مثلاً کلکتہ، لاہور اور آگرہ غازی پور کے جابجا قائم ہوتے جاتے ہیں اور عورتوں کی تعلیم خواہ پردے میں خواہ مدرسے میں ہو، اب ایسا سوال نہیں رہا جس پر کچھ حجت اور شک وشبہہ باقی رہے۔'' (10)

سرسید نے تعلیمِ نسواں کے سلسلے میں متعدد اپنے مضامین اور اداریوں میں اظہارِ خیال کیا اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے متعدد شمارے اس اجمال کی تفصیل پر گواہ ہیں۔ سرسید نے ایجوکیشن کمیشن کے سامنے اپنے خاندان کی عورتوں کے پڑھے لکھے ہونے کا ذکر کر کے اس کی تردید کی تھی کہ مسلمان عورتیں جاہل ہوتی ہیں (11) سرسید کی چہیتی پوتی یعنی سید حامد کی اکلوتی بیٹی احمدین بیگم اپنے دادا سرسید سے گیارہ بارہ سال کی عمر میں خط و کتابت کرتی تھیں ان خطوط سے بھی پتہ چلتا ہے کہ سرسید کے خاندان کی لڑکیاں بھی تعلیم یافتہ تھیں۔ (12)

اس میں شک نہیں کہ سرسید کا تعلق معاشرے کے جس طبقے سے تھا، اس طبقے کے فرد کی حیثیت سے خواتین کے بارے میں ان کا رویہ جذبۂ تحسین سے مملو نظر آتا ہے اور وہ عورتوں کی تعلیم و تربیت کے مسائل کو یکسر فراموش نہیں کرتے۔ جو لوگ انہیں عورتوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں مستعد نظر آتے ہیں وہ ان کی کوششوں کو فراخ دلی سے سراہنے سے گریز نہیں کرتے۔

پروفیسر شمیم نکہت سرسید کی تعلیم نسواں سے متعلق پالیسی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتی ہیں۔ ''سرسید کا اصل مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو ذہنی، معاشرتی اور اخلاقی پستی سے نکالنا تھا۔ سرسید یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ خواب اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا جب تک مردوں کے ساتھ عورتوں کی تعلیم واصلاح اور مذہبی عقائد ورسومات کو درست نہ کیا جائے۔ اسی لئے سرسید نے 1870ء سے ''تہذیب الاخلاق'' میں عورتوں کی تعلیم، کثرتِ ازدواج اور رفاہِ عام وغیرہ عنوانات پر کئی مضامین لکھے۔ سرسید تحریک کے اثر سے بہت جلد ایک معقول اور روشن خیال مسلمان حلقہ بن گیا جس نے عام مسلمانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم واصلاح پر بھی خصوصیت کے ساتھ زور دیا۔ علی گڑھ میں 1904ء میں عورتوں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی جس کے بانی شیخ عبداللہ صاحب تھے، جس میں عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے سلسلے میں بہت سے فیصلے کئے گئے۔'' (13)

سرسید کی تحریک پر جب مسلمان لڑکوں کو انگریزی تعلیم دینے کی بات چلی تو مولویوں نے فتویٰ دیا کہ انگریزی تعلیم کفر ہے۔ اس وقت لڑکوں کی تعلیم کے ہی لالے پڑے تھے تو بھلا لڑکیوں کو پڑھانے لکھانے کا سوال کہاں پیدا ہوسکتا تھا.......ہندو سوسائٹی میں مختلف اصلاحی تحریکوں میں برہمو سماج، آریہ سماج، پرارتھنا سماج اور مہارشی کردے جیسے لیڈروں کے زیرِ اثر زنانہ اسکول کھلتے جارہے تھے لیکن مسلمانوں کے لئے پردہ ترک کرنے کا مسئلہ ایسا تھا کہ جس کے بارے میں سوچنا ہی محال تھا۔ شمالی ہندوستان کی ہندو سوسائٹی میں بھی پردہ بہت حد تک موجود تھا.. اس صورت میں اسکول میں پڑھنا اور عیسائی مذہب اختیار کرنا ہم معنی سمجھا جاتا تھا۔ (14)

1857ء کے خونی انقلاب کے بعد ہی سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کو جدید تعلیم کے مواقع فراہم کرانے کے لئے عملی کوششیں شروع کردی تھیں۔ وہ جس اعلیٰ پیمانے پر ایک مسلم یونیورسٹی کو قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے اس کی تکمیل اسی وقت ممکن ہوتی جب ولایت جاکر وہاں کے طرزِ تعلیم اور اصولِ تدریس سے بذاتِ خود واقفیت بہم نہ پہنچائیں۔ اتفاق سے برطانوی حکومت نے ہندوستان کے ذہین اور لائق طلباً کو لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے چھ ہزار روپیہ کے نو وظیفے دینے منظور کئے۔ اس کے علاوہ ہر طالب علم کے لئے تین ہزار روپیہ آمدو

رفت کے اخراجات کے بھی منظور کیئے۔ اتر پردیش کی سرکار نے سر سید کے فرزند سید محمود کو اس وظیفے کے لئے مستحق قرار دیا۔ حکومت کے اس فیصلے سے سر سید کے ارادے کو زبردست تقویت پہنچی اور یہی سرکاری امداد ان کو ولایت تک کے سفر کے لئے ان کی دیرینہ آرزو کی تکمیل بنی۔ یہ سفر پانچ افراد پر مشتمل تھا جس میں سر سید، ان کے دونوں صاحبزادگان سید حامد اور سید محمود، مرزا خداداد بیگ اور ایک ذاتی ملازم چھجو بھی تھا۔ سر سید نے اس سفر کے لئے علی گڑھ کا اپنا مکان بھی مولوی سمیع اللہ خاں کے ہاتھ گروی رکھا اور اپنے قیمتی کتب خانے کو بھی کم قیمت پر بیچ ڈالا تھا۔

سر سید پانی کے جس جہاز میں سوار تھے اس میں ان کی ملاقات مس کارپینٹر سے ہوئی جو برسٹل کی رہنے والی تھی اور کلکتہ و بمبئی میں ہندوستانی عورتوں کی تعلیم کے لئے کام کر چکی تھی۔ مس میری کارپینٹر 1866ء میں ہندوستان میں تعلیم نسواں کے فروغ کے لئے آئی تھی اور ایشور چندرو دیا ساگر سے مل کر کلکتہ میں تعلیمِ نسواں کا کام کیا اور لڑکیوں کا نارمل اسکول قائم کیا تاکہ لڑکیوں کو پڑھانے کے لئے استانیاں تیار ہو سکیں۔ (15)

مس کارپینٹر راجہ رام موہن رائے کی بھی عقیدت مند تھی اور انہوں نے بتایا کہ راجہ رام موہن رائے ان کے والد بزرگوار سے ملنے برسٹل گئے اور اسی کے گھر میں رہتے تھے اور وہیں انتقال ہوا۔ انہوں نے راجہ رام موہن رائے سے ہندوستانی خواتین کی جہالت اور زبوں حالی کا ذکر سنا تھا، چنانچہ عورتوں کی اصلاح اور تربیت کا جذبہ انہیں ہندوستان کھینچ لایا۔ مس کارپینٹر نے سر سید سے فرمائش کی کہ وہ ان کی نوٹ بک میں ہندوستانی عورتوں کی تعلیم و تربیت کے مسئلے پر اظہارِ خیال تحریر فرمائیں۔ چنانچہ سر سید نے اس میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی:

''مجھ کو بڑودہ دخانی جہاز میں جبکہ میں لندن کو جاتا تھا مس کارپینٹر صاحبہ سے ملاقات ہونے کی عزت اور بے انتہا مسرت حاصل ہوئی۔ جب سے میں نے ان کا نام اور ان کی کوششوں کا حال نسبت تعلیم ہندوستانی عورات کے سنا تھا، میں بہت مشتاق ان کی ملاقات کا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بطور نعمت غیر مترقبہ ان سے ملاقات ہوگئی۔

ان کی عالی ہمتی اور بلند نظری اور تہذیب، اخلاق اور نیک نیتی کا ثبوت خود وہی مضمون ہے جو انہوں نے اختیار کیا ہے یعنی اس گروہ کی (جس کو خدا تعالیٰ نے مرد کے لئے بطور دوسرے

ہاتھ کے بنایا ہے اور جس کو نیک کاموں کے بخوبی انجام ہونے کے لئے مرد کا مددگار کیا ہے) تعلیم وتربیت میں کوشش کرنا۔ درحقیقت یہ مضمون اور اس پر ان کی کوشش نہایت قدر کے لائق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر نیک کام پر کوشش ہونی (گو وہ کسی طرح پر ہو) نہایت اچھی ہے کیونکہ اگر وہ کوشش درست بنیاد پر قائم ہوئی ہے تو وہ خود کامیاب ہوگی اور اگر اس میں کچھ غلطی ہے تو اس سے امید ہے کہ وہ اوروں کو اس نیک کام پر کوشش کرنے کی تحریک ہوگی جس سے توقع ہے کہ کوئی نہ کوئی بغیر کسی غلطی کے شروع ہوگی اور ٹھیک ٹھیک نیک نتیجے تک پہنچے گی۔

نیک کام میں کوشش کرنے والوں کی کوششیں کبھی کبھی اس لئے کہ وہ ان لوگوں کی عادت ورسم ورواج کے مخالف طریقے پر جن کی بھلائی کے لئے کوشش کی جاتی ہے، قائم کی گئی ہیں۔ برباد ہوگئی ہیں، حقیقت میں ایسا کرنا گویا نیچر کا مقابلہ کرنا ہے اور خود اس نیکی کی رکاوٹ کا آلہ بننا ہے۔ خدا نے یوشع کے لئے سورج کا تھم جانا کہا حالانکہ شاید وہ غلط تھا کیونکہ اگر وہ واقعہ بھی ہوا ہو تو شاید زمین کا تھم جانا سچ ہوتا مگر خدا نے نیک بات پھیلانے میں بالکل عام سمجھ کی جو اس زمانے میں تھی، رعایت کی۔ پس اگر اب ہم کسی نیک بات کے پھیلانے میں عام رواج کی رعایت نہ کریں گے تو خود خدا کی اس حکمت کو توڑیں گے اور خود اپنے لئے نقصان کا سبب ہوں گے۔

بہرحال میں خدا سے چاہتا ہوں کہ مس کارپینٹر صاحبہ کی کوششیں کامیاب ہوں اور ہندوستان میں کیا مرد اور کیا عورت سچائی اور علم کی روشنی سے جو دونوں اصل میں ایک ہیں روشن ضمیری حاصل کریں۔" (16)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ سرسید عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا رفیقِ کار سمجھتے تھے اور عورت کی تعلیم وتربیت کی کوشش کو مستحسن قرار دیتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس مہم میں پیش آنے والی مشکلات کا بھی اندازہ لگاتے ہیں جن کو کامیابی سے سر کرنے کے لئے گو ابھی وقت درکار ہے، تاہم جدوجہد جاری رکھنا انسانی فہم ودانش کا تقاضہ ہے کہ اس طرح نیکی اور ترقی کی راہیں استوار ہوتی ہیں۔

انگلستان کے سفر کے دوران ان کی نظر ایک مسلم آیا پر بھی پڑی جس کا نام نصیبا تھا جو کانپور کی رہنے والی پٹھان تھی۔ اس کا بیان ہے کہ وہ اکیسویں مرتبہ یوروپ آئی ہے، ہمیشہ انگریزوں

اوران کے بچوں کو ٹھیکہ پر ولایت پہنچانے آتی ہے اور پہنچا کر چلی جاتی ہے۔ انگریزی بخوبی بولتی ہے۔ انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ، آئر لینڈ، فرانس، پرتگال اور دیگر مقامات اس نے دیکھے ہیں۔ سرسید نے اس کو دیکھ کر کہا کہ ''وہ بھی نہر سوئز سے کچھ کم عجیب نہیں'' اور دل ہی دل میں کہا کہ ''شاباش تو تو مردوں سے بھی اچھی ہے'' (17)

2 / مئی 1869ء کو وہ پیرس کے وارسیل محل کے عجائب خانے میں لگی ایک تصویر کو دیکھ کر اسے عورتوں کی تذلیل سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''اس تمام تصویر خانے میں صرف ایک ہی بات تھی جو فرنچ کی شجاعت اور سویلیزیشن (تہذیب و شائستگی) کو بٹہ لگاتی تھی اور مجھ کو اسے دیکھ کر نہایت تعجب ہوا کہ ایسی بہادر اور شجاع اور سپاہی قوم نے جو سویلیزیشن کے زیور سے بھی نہایت آراستہ ہے، ایسی عجیب بات جو ان خوبیوں کے برخلاف ہے کیونکر کی ہے؟ الجزائر کے محاربات کی تصویروں کے کمرے میں امام عبدالقادر کی عورتوں کو گرفتار کرنے کی تصویر بنائی ہے، اس کی عورتیں اونٹ پر کجاوے میں تھیں، فرنچ سپاہیوں نے اونٹ کو بٹھا کر کجاوہ گرادیا ہے اور عورتیں اس میں سے نکل پڑی ہیں اور ان کے بدن سے کپڑا ہٹ گیا ہے اور فرنچ سپاہی سنگین اٹھائے ہوئے اور ان کی نوکیں عورتوں کی طرف کیے ہوئے کہ گویا اب ماریں گے، گرد کھڑے ہوئے ہیں۔ کیا فرنچ کو یہ زیبا تھا کہ عورتوں کی گرفتاری کی تصویر اپنے محل میں لگاتے؟ کیا عورت پر سنگین سیدھی کرنی اور اس کو کجاوے میں گرادینا فرنچ سپاہیوں کی بہادری کی یادگار تھی؟ کیا ایک عورت کا تصویر میں کپڑا بدن پر سے ہٹا ہوا بنا دینا (بالفرض اگر ایسا ہوا بھی ہو) فرنچ کی سویلیزیشن کے مناسب تھا؟'' اس تصویر کا ذکر کرتے ہوئے سرسید کہتے ہیں کہ ''ایک غیرت مند مسلمان کے لئے ان عورتوں کو ایسی بے کسی کے عالم میں دیکھنا۔ آنکھوں سے خون ٹپکانے کے لئے کافی ہے'' اور کہتے ہیں کہ ''اس تصویر کو فرنچ سپاہ کی بہادری کی یادگار سمجھنا اور عورت کا کپڑا تصویر میں بدن پر سے ہٹا ہوا بنانا فرانس کے لئے قابلِ شرم ہے اور اس کی شائستگی کو دھبہ لگاتا ہے۔ (18)

پیرس میں سرسید ایک دوکاندار لڑکی کے حسنِ اخلاق سے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ عورت نہایت خوش لباس پہنے ہوئے کس طرح بلبل کی طرح انگریزی بولتی ہے، نہایت

شائستہ گفتگو کرتی ہے اور سرسید اور ان کے ہم سفروں کو دستانے پہناتی ہے۔ پیرس میں ڈنر پر جانے کے لئے، لیڈیز سے ملنے کے لئے اور حکمرانِ وقت سے ملنے کے لئے دستانے پہننا ضروری ہوتے تھے۔ سرسید لکھتے ہیں کہ ''وہ عورت چار زبانیں جانتی تھی، فرنچ، انگریزی، اٹالی اور جرمن اور چاروں میں نہایت عمدہ گفتگو کرتی تھی اور یہ صرف اس لئے سیکھی تھی کہ جس ملک کا خریدار آوے اس سے باآسانی گفتگو کر سکے''(19)

انگلستان میں قیام کے دوران سرسید چند انگریز خواتین کے حسنِ اخلاق اور کارکردگی سے بہت متاثر ہوئے۔ تہذیب وشائستگی کے ان نمونوں پر وہ بڑی حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ لندن میں اپنے قیام کے دوران سرسید جس مکان کے ایک حصہ میں کرایہ دار کے طور پر رہتے تھے وہ مسٹر جے لڈلم (J. Ludlam) کا تھا۔ مسٹر لڈلم کے اس مکان میں سرسید کے تصرف میں چھ کمرے تھے جس میں چار بیڈروم علیحدہ علیحدہ چار لوگوں کے لئے تھے۔ ایک ڈرائنگ روم اور ایک کھانے کا کمرہ تھا۔ مسٹر لڈلم نہایت لائق اور قابل انسان تھے اور کئی علوم سے واقف تھے اور جب فرصت ملتی تورات کی مجلسوں میں کیمسٹری، بایولوجی اور زولوجی وغیرہ پر لیکچر ہوتے تھے۔ وہ اپنے کاموں میں مصروف رہتے تھے، انہیں آفس جانے اور جلسہ جلوس میں شرکت کرنے کے علاوہ کسی چیز سے سروکار نہیں تھا۔ ان کی بیگم نے اپنے شوہر کو تمام گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد کر رکھا تھا۔ وہ ایسی تعلیم یافتہ، شائستہ اور نیک بی بی تھیں کہ بقول سرسید ''زبان اس کی خوبیاں بیان کرنے سے قاصر ہے۔ تہذیب اور اخلاق اور ادب اور انسانیت سب چیز کی مجسم ہے۔ تمام کام اور تمام معاملات خانہ داری کے نہایت لیاقت سے خود کرتی ہے''

مسز لڈلم کی دو بہنیں مس ایلن ویسٹ اور مس فینی ویسٹ بھی انہیں کی طرح پڑھی لکھی تھیں۔ ان میں سے ایک ایلن ویسٹ مطالعہ کی بلا کی شوقین تھیں حتیٰ کہ بیماری کے دوران بھی سرسید سے کتاب پڑھنے کے لئے منگا بھیجتی تھیں۔ سرسید کے لئے یہ تجربہ ناقابلِ فراموش تھا کہ ایک عورت عالمِ بیماری میں کتب بینی سے دل بہلائے اور پھر مذہبی موضوع سے متعلق اس کتاب پر تبصرہ کرنے کی اہلیت بھی رکھے۔

اپنی مکان مالکہ اور اس کی بہن کی تعلیم وتربیت اور شائستگی سے متاثر ہوکر وہ اپنے اس

سفر نامے میں یوروپین اور ہندوستانی خواتین کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''بس اب سمجھنا چاہئے کہ متوسط درجے سے کس قدر کم درجے کی عورتوں کی تو کیسی عمدہ تعلیم ہے! کیا یہ تعجب انگیز بات نہیں کہ ایک عورت حالتِ بیماری میں کتاب پڑھنے سے دل بہلائے۔ آپ نے ہندوستان میں کسی امیر، کسی نواب، کسی راجہ، کسی مردِ اشراف کو ایسی خصلت کا دیکھا ہے؟

اگر ہندوستان میں کوئی عورت بالکل برہنہ بازار میں پھرنے لگے تو ہمارے ہم وطنوں کو کیسا تعجب اور کس قدر حیرت ہوگی۔ بلا مبالغہ یہ مثال ہے کہ جب یہاں کی عورتیں یہ سنتی ہیں کہ ہندوستان کی عورتیں پڑھنا لکھنا نہیں جانتیں اور حلیہ ترتیب اور زیورِ تعلیم سے بالکل برہنہ ہیں تو ان کو ایسا ہی تعجب ہوتا ہے اور کمال نفرت اور کمال حقارت ان کے خیال میں گزرتی ہے''۔ (20)

سرسید کی مہربان لینڈ لیڈی نے ان کے گھریلو کاموں کے لئے دو خادماؤں کو بھی رکھ چھوڑا تھا۔ جن کے نام اینی اسمتھ اور ایلزبتھ میتھیوز تھے۔ انگلستان کی یہ معمولی خادمائیں بھی وقت کی پابند اور فرض شناس تھیں اور ہر خدمت خندہ پیشانی سے بجالاتی تھیں۔ انگلستان کی یہ خواتین اپنی لیاقت، تہذیب و شرافت اور فرض شناسی سے سرسید کو بے حد متاثر کرتی ہیں جس کا حال وہ بڑی تفصیل اور ذوق وشوق سے اپنے دوست راجہ جے کشن داس کو خط میں تحریر کرتے ہیں ''اگر ہندوستان میں جاوے اور اچھے سے اچھے آدمیوں کی عورتوں سے ملے تو ان کو محض جانور سمجھے اور نہایت حقارت سے ان سے نفرت کرے۔ یہ صرف نتیجہ عام تعلیم و تربیت کا ہے''

اس نوعمر لڑکی ایلزبتھ میتھیوز کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ ''باوجود قلتِ تنخواہ کے ہمیشہ ہاف پینی والے اخبار جس کا نام ''ایکو'' (Echo) ہے مول لیتی ہے اور جب کام سے فرصت ملی تو اس کو پڑھتی ہے، کبھی پنچ اخبار کا کوئی پرچہ لے کر اس میں جو تصویریں عورتوں کی ہوتی ہیں ان کو دیکھتی ہے اور اس کے ایڈیٹر کے کنایے اور اشارے کو پڑھتی ہے اور طبیعت خوش رکھتی ہے۔''

لندن میں اپنے سترہ ماہ کے قیام کے دوران سرسید احمد خاں جہاں انگریز خواتین کی تعلیم و تربیت کے دلدادہ نظر آتے ہیں وہیں وہ مصر اور ترکی کی مسلم خواتین کی تہذیب و شائستگی پر باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ مصر کی ایک مسلمان لڑکی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں ''روم اور مصر دونوں میں روز بروز تعلیم کی ترقی ہے، عورتیں بھی روز بروز بہت زیادہ پڑھی لکھی ہوتی جاتی ہیں۔

مصر کی ایک مسلمان لڑکی کا میں نے حال سنا ہے کہ سوائے عربی زبان کے جو اس کی اصل زبان ہے اور جس میں وہ نہایت فصاحت سے لکھتی پڑھتی ہے، فرنچ زبان بھی نہایت خوب بولتی ہے اور لیٹین اس قدر جانتی ہے کہ جو مضمون یا شعر اس کے سامنے رکھا جائے اس کو پڑھ لیتی ہے اور مضمون سمجھ لیتی ہے۔ اس کے بھائی نے فرانس میں تربیت پائی تھی، جب وہ اپنے گھر گیا تو اس کی بہن نے جس کو پڑھنے کا بہت شوق تھا اور اپنے کنبے کے بزرگوں سے اس نے اپنی زبان عربی میں بہت کچھ پڑھا تھا، اپنے بھائی سے فرنچ اور لیٹن سیکھ لی'' (21)

سر سید نے لندن میں کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کو بھی دیکھا اور ان یونیورسٹیوں کے نظام پر غور کیا۔ بقول محسن الملک ''اس شخص کا ولایت جانا قوم کے واسطے تھا، رہنا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم کے واسطے۔'' لندن میں اپنے قیام کے دوران ہی انہوں نے ہندوستان میں ایک مسلم یونیورسٹی کے قیام کا عملی خاکہ مرتب کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سوشل اور پولیٹیکل حالت درست کرنے کے لئے ایسوسی ایشن قائم کرنے یا کاغذ کی ناؤ سے اس دریا کو طے کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے بلکہ جب تک ان میں انگریزی تعلیم نہ پھیلائی جائے گی، ان کی بھلائی کی تمام تدبیریں ایسی ہی فضول اور بے کار ثابت ہوں گی جیسے کسی کھیت میں تخم ریزی سے پہلے آب پاشی کرنا۔

سر سید جب تک لندن میں رہے، وہ قوم کی ترقی کے منصوبے بناتے رہے۔ انہوں نے لندن میں اسپیکٹیٹر (Spectator) اور ٹیٹلر (Tatlor) کا مطالعہ بھی کیا۔ انہی دو رسالوں سے متاثر ہوکر انہوں نے 1870ء میں تہذیب الاخلاق شائع کیا۔ اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر وہ جریدے تھے جن کی اشاعت نے لندن کے جامد نظامِ حیات میں ہل چل مچادی اور اخلاقی، تعلیمی اور سماجی حیثیت سے اصلاح کا کام کیا اور وہاں کے عوام کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اٹھارھویں صدی تک انگلینڈ ذہنی اور تعلیمی حیثیت سے بہت پسماندہ تھا۔ اس زمانے میں عورتوں کی تعلیم مذموم سمجھی جاتی تھی۔ ان پرچوں نے تعلیمِ نسواں کی حمایت کی اور تمام سماجی برائیوں کی بیخ کنی کی۔ خود سر سید تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں کہ:

''ان پرچوں کے جاری ہونے سے انگریزوں کے اخلاق اور عادات اور دینداری کو

نہایت فائدہ پہنچا اور ہر ایک کے دل پر ان کا اثر ہوا۔ جس زمانے میں کہ پہلے ٹیٹلر نکلا ہے انگلستان کے لوگوں کی جہالت اور بد اخلاقی اور نا شائستگی نفرت کے قابل تھی۔'' اسی مضمون میں سرسید آگے لکھتے ہیں: ''عورت کا پڑھا لکھا ہونا اس کی بدنامی کا باعث ہوتا تھا۔ اشرافوں کے جلسوں میں امورات سلطنت کی باتیں ہوتی تھیں اور عورتیں آپس میں ایک دوسرے کی بدگوئی کیا کرتی تھیں۔ قسموں پر قسمیں کھانا اور خلاف تہذیب باتیں کرنا گویا ایک بڑی وضع داری گنی جاتی تھی۔ قمار بازی اور شراب خوری اور خانہ جنگی کی کچھ حد نہ تھی۔ چارلس دوم کے عہد میں جو خرابیاں تھیں وہ شریف اور اعلیٰ درجہ کے لوگوں کی گویا عادت ہوگئی تھی۔ بیلوں اور ریچھوں کو کتوں سے بھڑوانا، لوگوں کو انعام دے کر لڑوانا اور خود ایسے تماشوں کو دیکھ کر خوش ہونا گویا ہر ایک امیر کے شوق کی بات تھی۔'' (22)

سرسید احمد خاں نے مسلم معاشرے میں پھیلی خرابیوں کو دور کرنے اور عمدہ تہذیب پیدا کرنے کے لئے 29 نکات کا منشور بھی تیار کیا تھا اور ان کی اصلاح کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کیا۔ ان نکات میں سے تین نکات خاص طور سے عورتوں سے متعلق تھے۔ سرسید چاہتے تھے کہ لڑکیوں کی تعلیم اور دستکاری سکھانے کا انتظام ہونا چاہئے۔ وہ رفاہِ عورتوں کی حالت میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنے پر زور دیتے تھے۔ وہ کثرتِ ازدواج کے بھی قائل نہیں تھے جب کہ اسلام چار شادیوں کی اجازت دیتا ہے مگر سرسید کا خیال تھا کہ '' احکام خداوندی کے خلاف کئی بیویوں سے سلوک کرنے سے بہتر ہے تعداد ازدواج سے پرہیز کیا جائے۔'' (23)

سرسید احمد خاں نے تہذیب الاخلاق سے وہی کام لیا جو اٹھارھویں صدی میں اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر نے لندن کی فرسودہ رسم و رواج کو دور کرنے اور ان میں اعلیٰ اخلاق و کردار کے لئے کیا تھا اور یہ اخبارات انگلینڈ کی سماجی زندگی کی عکاسی کرتے تھے۔

سرسید کو لندن میں اپنے قیام کے دوران دو مرتبہ ملکہ وکٹوریہ سے بھی ملنے کا موقعہ ملا۔ پہلی مرتبہ 6/نومبر 1869ء کو جب وہ ایک پل کا افتتاح کرنے آئی تھیں اور دوسری مرتبہ 11/مارچ 1870ء کو ملکۂ معظمہ کے شاہی محل میں جہاں سرسید نے ملکہ کے ہاتھ کا بوسہ لیا۔ ملکہ وکٹوریہ سرسید سے دو سال چھوٹی تھیں اور وہ ملکہ کی شان و عظمت کو ان کی مادرِ مشفقہ کی تعلیم کا

نتیجہ قرار دیتے ہیں اور ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر ہی سر سید نے بھی اپنے اسکول کا افتتاح ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ تاریخِ پیدائش 24 / مئی 1875ء کو کیا تھا۔

سر سید کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ 1869ء میں ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم سے متعلق مضامین اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ 22 / اکتوبر 1869ء کو سر سید لندن سے ایسے ہی ایک مضمون سے متعلق لکھتے ہیں کہ ''میری دانست میں ایسا سچا اور ٹھیک اور بالکل درست آرٹیکل عورتوں کی تعلیم کی نسبت کوئی نہ چھپا ہوگا۔'' اپنے اس خط میں سر سید کہتے ہیں کہ ''پس ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو کون منع کرتا ہے کہ خود بلا مداخلت لڑکیوں کو پڑھانے کا انتظام کریں اور تمام مذہبی اخلاق اپنے اپنے مذہب کے موافق تعلیم دیں۔ کیا ہندوستان ایسا نہیں کرسکتا۔ بے شک کرسکتا ہے۔ کسی طرح ان کاموں کے لئے بلکہ اور اس سے بہت بڑے بڑے کاموں کے لئے وہ محتاج نہیں ہے۔ صرف شوق اور ہمت اور ارادہ چاہئے۔

پس امید ہے کہ آپ ہندوستان کی بھلائی کے لئے صرف اوروں پر ہی نگاہ نہ رکھئے بلکہ اس سے بالکل قطع نظر کیجئے اور خود اپنے ہم وطنوں کو ایسی نصیحت کیجئے جو وہ ان نیک کاموں پر خود مستعد ہو جاویں اور یہ بھی '' آپ خوب یاد رکھئے کہ جب تک کوئی قوم خود اپنی بھلائی اور ترقی و تہذیب کی طرف متوجہ نہیں ہوتی کبھی اس کو عزت و ترقی نصیب نہیں ہوتی۔''

سر سید احمد خاں کے اس خط سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ تعلیمِ نسواں کے لئے کتنے فکر مند تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ہندو اور مسلمان خود لڑکیوں کے تعلیمی ادارے قائم کریں۔

لندن میں اپنے قیام کے دوران ہی سر سید نے ہندوستان میں پھیلی ہوئی سیاسی ابتری، معاشی بحران، تعلیمی بے مائیگی اور تہذیب، شکست و ریخت کا اعلان مغربی تعلیم کے حصول میں دیکھا اور فکر و نظر کے پیمانوں کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈھال دینے کا احساس دلایا۔ (24)

سر سید احمد خاں اور ان کے رفقاً کی کوششوں سے 1875ء میں علی گڑھ میں ''مدرسۃ العلوم مسلمانانِ ہند'' کے قیام کے بعد 12 / نومبر 1875ء کو سر سید نے سر ولیم میور کو وزیٹر کی حیثیت سے ابتدائی مدرسہ میں مدعو کر کے شاندار استقبالیہ دیا اور بیگم میور کے ہاتھوں ایک درخت لگوا کر میور پارک کا افتتاح فرمایا (25) گویا مدرسہ کے ابتدائی زمانے میں ہی اس ادارے میں عورت کی

عظمت اور اس کے رتبے کو تسلیم کیا گیا۔

سر ولیم میور نے مدرسہ کے زمانے میں ہی مسلمانوں میں تعلیمِ نسواں کی اہمیت اور ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے کہا تھا کہ ''مسلمان مستورات کی تعلیم کرنے میں توجہ نہیں کرتے اور اس سبب سے نصف آدمی جہالت میں رہتے ہیں۔ایک اخبار سے جناب خدیو یعنی والیٔ مصر کا حال معلوم ہوا کہ ان کی ایک بیگم نے لڑکیوں کا اسکول جاری کیا ہے۔مکان عمدہ بنایا ہے جس میں دوسو لڑکیاں رات دن رہتی ہیں اور سو پڑھنے کو آتی ہیں۔ملک شام سے ایک عورت ستّی روسا کو بلایا ہے۔وہ ان کو ہر قسم کے ہنر کا کام ولایت اور مصر اور مشرقی ہنر عمدہ باریک کام، کھانا پکانا، حساب کا لکھنا پڑھنا اور علم مناسب سب سکھاتی ہے۔

جب میں نے اس خبر کو پڑھا تو میرے دل میں آیا کہ کاش کوئی شخص اس ملک میں بھی والیٔ مصر کی بیگم کی مانند کوئی اسکول جاری کرے پس یہی تمہاری نظیر بنے کہ اس طرح تم اپنے ہم عصروں کے لئے موجب فائدہ اور ترقی کے ہو سکے۔امید ہے کہ یہ سب باتیں تمہارے دل میں رہیں کہ علم کا چرچا ہو جاوے۔اے لڑکو نیک کرداری کو ملحوظ رکھو اور یاد رکھو کہ نہ صرف علم سے بلکہ دیانت داری، نیک کرداری، خدا پرستی، پرہیز گاری سے آدمی آدمی بنتا ہے۔یہ دونوں باتیں اس کالج میں حاصل ہونی چاہئیں اور ان اثروں کے باعث ان کا نام تمام ملک ہندوستان میں مشہور ہو۔'' (ایڈریس اینڈ اسپیچیز ،ایم اے او کالج 1919 - 1875 صفحہ 9)

8 رجنوری 1877ء کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے سنگِ بنیاد کی تقریب میں حصہ لینے کے لئے وائسرائے لارڈ لٹن کی آمد کے موقعہ پر سر سید ہاؤس میں ناشتے کی میز پر وائسرائے کی اہلیہ اور مسٹر دون کی بیگم جو وائسرائے کی پارٹی کے ساتھ ہی آئی تھیں وہ بھی ناشتے کی میز پر سر سید کے ساتھ شریک ہوئیں۔(26)

ایم اے او کالج کے سنگِ بنیاد کی تقریب کے مہمانِ خصوصی لارڈ لٹن تھے مگر لیڈی لارڈ لٹن نے کالج کی بنیاد کا پہلا پتھر رکھا۔جس کے لئے خان بہادر محمد حیات خاں نے ان کا شکریہ بھی ادا کیا۔(27)

سر جان اسٹر یچی معہ اپنی بیگم کے 10 دسمبر 1880ء کو علی گڑھ کالج تشریف لائے۔ان

کی بیگم ایک اچھی آرٹسٹ تھیں۔ انہوں نے سر سید کا ایک روغنی پورٹریٹ بھی بنایا۔ سر سید اس پورٹریٹ کے لئے اکثر الہ آباد جا کر آرٹسٹ کے سامنے بیٹھتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سر سید دقیانوسی نہیں تھے بلکہ بہت ہی لبرل اور ماڈرن شخص تھے۔

ایم اے او کالج کے پرنسپل اور زیادہ تر اساتذہ کیمبرج اور آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ انگریز تھے اور ان کی بیگمات بھی اپنے شوہروں کے ساتھ کالج کیمپس کے بنگلوں میں ہی رہتی تھیں۔ خود سر سید اکثر بعض معاملات میں ان خواتین سے بھی مشورے طلب کرنے لگے تھے۔ ان خواتین نے آئندہ کیمپس کی زندگی میں ایک نمایاں رول ادا کیا تھا۔ کالج کے اساتذہ اور طلباً مختلف مواقعوں پر ان پروفیسروں کے بنگلوں پر ان خواتین کی مہمان نوازی سے بہرہ مند ہوتے رہتے تھے اور ان کے رہائش کے طور طریقوں اور زندگی گذارنے کے سلیقہ سے متاثر ہوتے تھے۔ (28) یہ انگریز خواتین گھوڑوں پر سواری بھی کرتی تھیں اور رات کو بعض طلباً کو انگریزی کا درس بھی دیتی تھیں۔ تھیوڈر ماریسن کی بیگم نے چند طلباً کو انگریزی میں خطوط نویسی کے فن سکھانے کے لئے ایک کلاس بھی اپنے بنگلے میں شروع کر رکھی تھی جس میں سجاد حیدر یلدرم، ابو محمد اعجاز علی، محمد ظریف اور سر رضا علی شامل تھے۔ میر ولایت حسین اور سید جلال الدین حیدر بھی کبھی کبھی اس غیر رسمی کلاس میں شامل ہو جاتے تھے۔ (29) تھیوڈر ماریسن کی سفارش پر سر رضا علی کو جب سہارنپور میں سرکاری ملازمت مل گئی تو مسٹر ماریسن اور ان کی بیگم نے انہیں دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔

1891ء میں سڈنس کلب کے قیام کے سات سال پورے ہونے پر جشن کا اہتمام کیا گیا جس میں تمام یوروپین لیڈیز کو بھی مدعو کیا گیا۔ خود سر سید بھی شریک ہوئے۔ اسی عرصہ میں کالج کے پرنسپل مسٹر بیک لندن سے پہلی مرتبہ اپنی بیگم کو علی گڑھ لے کر آئے تو اس جلسہ میں ایک طالب علم خوشی محمد نے ایک نظم پیش کی جس میں بیگم بیک کا خیر مقدم کیا گیا۔

ہیں مسز بیک تازہ مہمان آج رات
خیر مقدم کر رہا ہے یونین

نومبر 1892ء کو پروفیسر آرنلڈ کے اعزاز میں سڈنس کلب میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا۔ وہ 29رفروری 1892ء کو لندن میں اپنی شادی کے بعد اپنی بیگم کو بھی علی گڑھ لائے تھے۔

آرنلڈ آگئے لندن سے ہندوستان میں
اک فرشتہ ساتھ لائے صورتِ انسان میں

ایم اے او کالج کے پرنسپل تھیوڈر بیک کی بیگم بھی کالج کے معاملات میں گہری دلچسپی لیتی تھیں۔ انہوں نے ہی انگلش ہاؤس بورڈنگ کے لئے مسز گری فیتھس (Griffiths) کو اس نئے ہاسٹل کا لیڈی سپرنٹینڈینٹ بنانے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ بدقسمتی سے انہیں ہندوستان کی آب و ہوا راس نہیں آئی اور 1904ء میں مس ہیرس (Harris) کو ان کی جگہ لڑکوں کے اس ہاسٹل کا لیڈی سپرنٹنڈینٹ مقرر کیا گیا۔

یوروپین پروفیسروں کی بیگمات کا ایم اے او کالج کے بعض طالب علموں سے اتنا گہرا ربط وضبط ہو گیا کہ وہ اپنے بنگلوں پر ان طالب علموں کی چائے اور ٹوسٹ سے خاطر و مدارات کرتیں اور انہیں پڑھاتی بھی تھیں۔ بیگم ماریسن خطوط نویسی کا فن سکھاتیں، بیگم آرچبولڈ انگریزی بولنا سکھاتیں اور بیگم ٹول (Towl) انگریزی کا تلفظ درست کراتیں (30)

لاہور میں منعقد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے جلسہ 1888ء میں وہ تعلیمِ نسواں کے متعلق فرماتے ہیں ''میں نے لندن میں اپنے دوستوں کی مہربانی سے ایسے زنانہ مدرسوں کو جہاں اشراف لڑکیاں پڑھتی اور رہتی ہیں دیکھا ہے۔ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو حالت عمدگی، طمانیت اور تعلیم و تربیت کی ان مدرسوں میں ہے ہندوستان کو وہاں تک پہنچنے کے لئے ابھی سینکڑوں برس درکار ہیں۔''

اپنے افکار و نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے تہذیب النسواں، لاہور کے ایڈیٹر سید ممتاز علی کو ایک خط میں کہتے ہیں۔ ''میری دلی آرزو ہے کہ عورت کو بھی نہایت عمدہ اور اعلیٰ درجے کی تعلیم دی جاوے مگر موجودہ حالت میں کنواری عورتوں کو تعلیم دینا ان پر سخت ظلم کرنا اور رنج و مصیبت میں مبتلا کر دینا ہے۔ عورت کی تعلیم قبل مہذب ہونے مردوں کے نہایت ناموزوں اور عورتوں کے لئے آفت بے درماں ہے یہی باعث ہے کہ میں نے آج تک عورتوں کی تعلیم کے لئے کچھ نہیں کیا۔''

ایم اے او کالج کے ممتاز طالب علم اور اردو کے نامور ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی

سرسید کی تعلیمی پالیسی کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اس زمانے میں انہوں نے ''مصافِ زندگی'' کے لئے جو ''شمشیریں'' بنائیں وہ تمام تر مسلمان لڑکوں پر مشتمل تھیں۔ مسلمان لڑکیوں کے بارے میں شاید اسی طرح سوچا ہو جیسا کہ اب تک ہوتا آیا تھا کہ لڑکوں کی تعلیم وتربیت مقتضیات زمانہ کے مطابق صحیح خطوط پر ہونے لگے گی تو لڑکیاں از خود اسی رنگ میں ڈھل جائیں گی۔ یہ گمان بے سروپا نہ تھا، اس لئے کہ ایک موقعہ پر لڑکوں کی تعلیم وتربیت سے متعلق جو سرسید نے کیں وہ اسی گھریلو نظامِ تربیت کی تائید میں تھیں جوان کے عہد کی دلّی میں عام طور پر شرفائ میں رائج تھا۔ ممکن ہے ان کو اس کا بھی اندیشہ رہا ہو کہ جب لڑکوں کی تعلیم کے نظامِ نو پر مخالفت کا ایسا طوفان کھڑا کیا گیا ہے تو لڑکیوں کی تعلیم وتربیت پر عجب نہیں اگر پورا بیڑا ہی غرق ہو جائے۔ اس لئے انہوں نے اپنی پوری توجہ لڑکوں کی طرف مائل رکھی۔ ممکن ہے سرسید لڑائی کے اس اصول سے واقف ہوں کہ حالتِ جنگ میں پوری احتیاط اور کوشش اس کی کرنی چاہئے کہ حتی الوسع جنگ کم سے کم محاذ پر لڑنی پڑے۔ یہ وہ مشکل مقام تھا جہاں سرسید کے فیضانِ نظر سے بہرہ یاب نوجوان شیخ عبداللہ ''آہ وفغاں نیم شب کا پیغام آیا'' (31)

سرسید احمد خاں تعلیمِ نسواں کے حامی تھے مگر اپنے مشن میں مختلف دشواریوں کے پیشِ نظر انہوں نے اس مسئلہ کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اس لئے بعض لوگوں نے انہیں تعلیمِ نسواں کا مخالف تصور کر لیا۔

خود شیخ عبداللہ بھی سرسید کو تعلیمِ نسواں کا مخالف قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''حتیٰ کہ سرسید احمد خاں جیسے قوم کے رہنما نے بھی جدید تعلیمِ نسواں کی مخالفت کی اور اخیر تک مخالفت کرتے رہے....ادھر تو لڑکوں کی انگریزی تعلیم کے لئے یہ کوشش تھی ادھر لڑکیوں کے لئے ان کے سامنے انگریزی تعلیم کا نام لینا بھی دشوار تھا۔ میں نے جب اور جس موقعہ پر سرسید کی زبان سے تعلیم کے بارے میں آواز سنی اس میں لڑکیوں کے لئے انگریزی تعلیم کی مخالفت ہی سنی۔ جیسے کہ ہمارے مولوی صاحبان لڑکوں کے لئے بھی انگریزی تعلیم کو کفر سمجھتے تھے ویسے ہی سرسید انگریزی تعلیم کو لڑکیوں کے لئے ان کی اخلاقی حالت کے لئے مضر سمجھتے تھے۔'' (32)

شیخ محمد عبداللہ اپنی سوانح عمری ''مشاہدات وتاثرات'' میں اپنی طالب علمی کے زمانے

1896ء کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ’’اس دور میں تعلیم نسواں کا کچھ چرچا شروع ہوا۔ نواب محسن الملک اس تحریک کے موافق تھے۔ یہ بات میرے ذاتی علم میں ہے کہ سرسید لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مدارس جاری کرنے یا کسی جداگانہ انتظام کے مخالف تھے۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ لڑکیاں مدارس میں پڑھ کر لڑکوں کی طرح آزاد ہو جائیں۔ سرسید کے پاس اس اصولی امر کی تائید کے لئے کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہیں تھی جہاں تک میں نے غور کیا ہے اور سرسید کی زندگی کے عام حالات سے ذاتی واقفیت کی بنأ پر اس معاملے میں سرسید کی رائے مجھے نہ مصلحتاً معلوم ہوئی اور نہ مدبرانہ۔ میری اپنی رائے یہ قائم ہوئی تھی اور ہے کہ سرسید کے دل پر اس معاملے میں رسم و رواج کا بہت گہرا اور خاص اثر تھا۔ وہ خاص اس معاملے میں رسم و رواج کے دلدادہ تھے۔ وہ پردے کے معاملے میں سخت سے سخت قدامت پرست لوگوں کے خیال کے حامی تھے اور ان کو یہی زیادہ اندیشہ تھا کہ تعلیم پا کر لڑکیاں پردہ چھوڑ کر نکل آئیں گی۔ پردے کی ان کو بہت پاسداری تھی.....

میرا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ سرسید نے رواج پرستی اور قدامت پرستی کے غلبہ کی وجہ سے جو ان کے خیالات پر تھا لڑکیوں کی تعلیم کے معاملے میں مذہبی احکام کو بھی پسِ پشت ڈال دیا تھا کہ وہ مجھ سے بدرجہا زیادہ مذہبی احکام سے واقف تھے۔ انہوں نے بھی پڑھا ہوگا کہ جیسا میں نے پڑھا ہے کہ ہمارے پاک مذہب کا یہ حکم تھا کہ ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت کے لئے علم کا سیکھنا فرض کیا گیا ہے، اور علم کے حاصل کرنے کے لئے جس قدر مذہب اسلام نے تاکید کی ہے اس قدر کسی دوسرے مذہب نے نہیں کی۔‘‘ شیخ عبداللہ کے یہ تاثرات تعلیمِ نسواں سے متعلق سرسید کے نظریات سے ناواقفیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ انہوں نے ایجوکیشن کمیشن کے روبرو اپنی گواہی اور اپنی متعدد تحریروں میں ہمیشہ خواتین کی تعلیم کے حق میں آواز بلند کی مگر عملی دشواریوں کے پیشِ نظر مدرسۃ العلوم میں عورتوں کی تعلیم کا انتظام ابتدأً شروع نہیں کیا۔

شیخ محمد عبداللہ اپنی تحریروں میں تعلیم نسواں سے متعلق سرسیدؒ پر رسم و رواج کی پابندی کا الزام لگاتے ہیں جب کہ ایم اے او کالج کے قیام سے پہلے ہی 3 نومبر 1873ء کو مرزا پور انسٹیٹیوٹ میں سرسید نے جو لیکچر دیا تھا اس میں وہ رسم و رواج کے سخت مخالف نظر آتے ہیں اور

کہتے ہیں کہ ''مذموم رسمیں سماج کو گھن کی طرح برباد کرتی ہیں، قوم کی بھلائی اسی میں ہے کہ بری رسموں کا انسداد کیا جائے۔''(33)

سر سید احمد خاں اپنے مضمون ''عورتوں کے حقوق'' میں کہتے ہیں کہ ''اسلام نے اب سے سینکڑوں سال پہلے عورت کو جو مقام دیا ہے وہ دوسری قوموں میں اس کو حاصل نہیں بلکہ وہ بذاتِ خود ایک جا گیر سمجھی جاتی رہی۔'' اس مضمون میں ہندو مذہب، عیسائی اور اسلامی مذہب کی روشنی میں عورت کے حقوق پر روشنی ڈالی گئی ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے عورت کو جو سہولتیں اور جو مقام دیا ہے وہ کسی اور مذہب میں نہیں۔(34)

سر سید کی تحریروں اور تقریروں کا گہرائی سے مطالعہ کرنے پر یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ تعلیمِ نسواں کے مخالف نہیں تھے مگر اس وقت کے حالات ان کو اس بات کی اجازت نہیں دے رہے تھے کہ تعلیمِ نسواں کی شروعات کر کے وہ علماٗ کے سامنے ایک نیا محاذ کھولیں۔ سر سید کے سامنے پوری دنیا کی مہذب قوموں کی تاریخ بھی تھی اور انہیں اس بات کا مکمل یقین تھا کہ لڑکوں کی تعلیم کے بعد لڑکیوں کی تعلیم بھی عام ہو جائے گی اس لئے انہوں نے اپنی تمام تر توانائی لڑکوں کی تعلیم پر مرکوز کی۔ 1882ء کو ڈبلیو ایچ ہنٹر کی سربراہی میں ایجوکیشن کمیشن کے سامنے جو گواہی دی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ سر سید نے ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے تعلیمِ نسواں کے تمام پہلوؤں پر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''گورنمنٹ عملاً کوئی تدبیر ایسی اختیار نہیں کر سکتی جس سے اشراف خاندانوں کے مسلمان اپنی بیٹیوں کو تعلیم دلانے کے واسطے گورنمنٹ اسکولوں میں بھیجنے پر مائل ہوں اور نہ کوئی ایسا اسکول قائم کر سکتی ہے جو کہ ان لڑکیوں کے مربیوں کی طمانیت کے لائق ہو۔ میں مسلمانوں پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ وہ اپنی لڑکیوں کو ان اسکولوں میں نہیں بھیجتے اور یقیناً کوئی اشراف یوروپین بھی، گو وہ کیسا ہی تعلیم نسواں کا شوقین ہو، مسلمانوں پر ایسا الزام نہیں لگا سکتا، بشرطیکہ وہ اس ملک کے مدرسوں کی حالت سے واقف ہو......... جس حیثیت اور واقفیت کے مدارسِ نسواں ہندوستان میں ہیں اگر ایسے مدرسے انگلستان میں فرض کئے جائیں تو کیا اشراف خاندانوں کے انگریز اپنی لڑکیوں کو ان مدرسوں میں تعلیم کے لئے بھیجنا پسند کریں گے؟ ہرگز نہیں۔

عورتوں کی تعلیم کا معاملہ اس فلاسفر کے سوال سے نہایت مشابہہ ہے جس نے پوچھا تھا کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی یا انڈا؟ جن شخصوں کی یہ رائے ہے کہ مردوں کی تعلیم سے پہلے عورتوں کی تعلیم ہونی چاہئے وہ غلطی پر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی پوری تعلیم اس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ اس قوم کے اکثر مرد پورے تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں گے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی سوشل حالت پر غور کیا جائے تو اس وقت تک جو حالت مسلمان عورتوں کی ہے وہ میری رائے میں خانگی خوشی کے واسطے کافی ہے۔ جو کچھ بالفضل گورنمنٹ کو کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے بندوبست کی جانب کافی توجہ کرے۔ جب کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل بخوبی تعلیم و تربیت یافتہ ہو جائے گی تو مسلمان عورتوں کی تعلیم پر اس کا ضرور با ضرور ایک زبردست گو خفیہ اثر پہنچے گا۔ تعلیم یافتہ باپ یا بھائی یا شوہر بالطبع اپنی رشتہ مند عورتوں کی تعلیم کے خواہش مند ہوں گے..... اگر گورنمنٹ مسلمان شریف خاندانوں میں تعلیم نسواں کے جاری کرنے کی کوشش کرے گی تو حالت موجودہ میں محض ناکامی حاصل ہوگی اور میری رائے ناقص میں اس سے مضر نتیجے پیدا ہوں گے اور روپیہ اور محنت ضائع ہو جائے گی۔'' (35)

پنجاب کے گرداس پور میں سردار محمد حیات خاں کی بیگم نے 1884ء میں انہیں ''خواتینِ پنجاب'' کے ایک جلسہ میں مدعو کیا تا کہ تعلیمِ نسواں سے متعلق براہِ راست ان کے افکار و نظریات کے بارے میں علم ہو سکے۔ اس جلسہ میں ہندو، مسلمان اور عیسائی عورتوں نے بڑی تعداد میں شرکت فرمائی۔ رات کو منعقدہ اس جلسہ کو سرسید شب قدر سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''اے میری بہنو! آج کی رات میرے لئے شبِ قدر سے کم قدر کی نہیں ہے۔ جو ایڈریس تمہاری طرف سے مجھ کو دی گئی ہے وہ میرے لئے ایسی ہی عزت ہے جو آج تک ہندوستان میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ میں تمہاری اس شفقت کا دل سے شکر گزار ہوں۔

اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی مستورات کی بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ ہماری قوم کے مردوں نے اپنے باپ دادا کی بزرگی کو خاک میں ملا دیا ہے مگر خدا کے فضل سے تم میں ہمارے باپ دادا کے بزرگ نشان بدستور موجود ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم مردوں میں شبلی اور جنید موجود نہیں ہیں مگر خدا کا شکر ہے کہ تم میں ہزاروں لاکھوں رابعہ بصری موجود ہیں۔

تمہاری نیکی، تمہاری بردباری، تمہاری محبت، ہر قسم کی مشکلات کی برداشت اور اس پر صبر، بچوں کی پرورش، گھر کا انتظام ہمارے فخر کا باعث ہے۔ اگر کوئی قوم تمام دنیا میں اپنے تئیں کسی کا فخر دے سکتی ہے تو ہم اپنی قوم کی مستورات کو دنیا کی قوموں پر فخر دے سکتے ہیں۔ یہ ہمارا فخر تمہارے ہی سبب سے ہے۔

اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی خاتونوں کی تعلیم سے بے پرواہ نہیں ہوں۔ میں دل سے ان کی ترقی کا خواہاں ہوں۔ مجھ کو جہاں تک مخالفت ہے اس طریقۂ تعلیم سے ہے جس کے اختیار کرنے پر اس زمانے کے کوتاہ اندیش مائل ہیں۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا پرانہ طریقۂ تعلیم تیار کرنے پر کوشش کرو۔ وہی طریقہ تمہارے لئے دین و دنیا میں بھلائی کا پھل دے گا اور کانٹوں میں پڑنے سے محفوظ رکھے گا۔''

اس کے بعد سرسید نے پرانے طریقۂ تعلیمِ نسواں پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ''اے میری بہنو! تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت میں درستی ہوگئی ہو اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہوگئی ہو اور عورتوں کی حالت درست نہ ہوئی ہو۔ ان سچے واقعات نے میرے دل میں بہت کچھ اثر کیا ہے۔ میں نے تمہارے لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی ہے اس سے تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں، بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔ پس جو خدمت تمہارے لڑکوں کے لئے کر رہا ہوں درحقیقت وہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے ہے۔

میری یہ خواہش نہیں کہ تم ان مقدس کتابوں کے بدلے جو تمہاری دادیاں نانیاں پڑھتی آئی ہیں، اس زمانے کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانے میں پھیلتی جاتی ہیں۔ مردوں کو جو تمہارے لئے روٹی کما کر لانے والے ہیں، زمانے کی ضرورت کے مناسب کچھ ہی علم یا کوئی سی زبان سیکھنے اور کیسی ہی نئی چال چلنے کی ضرورت پیش آتی ہو مگر ان تبدیلیوں سے جو ضرورت تعلیم کے مطابق تم کو پہلے تھی اس میں کچھ تبدیلی نہیں ہوئی۔

تمہارا فرض تھا کہ تم اپنے ایمان اور اسلام سے واقف ہو، اس کی نیکی اور خدا کی عبادت

کی خوبی کو تم جانو، اخلاق میں نیکی اور نیک دلی رحم و محبت کی قدر سمجھو اور ان سب باتوں کو برتاؤ میں لاؤ، گھر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں رکھو، اپنے گھر کی مالک رہو، اس پر مثل شہزادی کے حکومت کرو اور مثل ایک لائق وزیر زادی کے منتظم رہو، اپنی اولاد کی پرورش کرو، اپنی لڑکیوں کو تعلیم دے کر اپنا سا بناؤ، خدا پرستی، خدا ترسی ہمسایوں کے ساتھ ہمدردی اپنا طریقہ رکھو۔ یہ تمام سچی تعلیم نہایت عمدگی سے ان کتابوں سے حاصل ہوتی ہے جو تمہاری دادیاں، نانیاں پڑھتی تھیں۔ جیسی وہ اس زمانے میں مفید تھیں ویسی ہی اس زمانے میں مفید ہیں۔ پس اس زمانے کی نامفید اور نامبارک کتابوں کی تم کو کیا ضرورت ہے؟ ہاں یہ بات سچ ہے کہ تمہارے خاندانوں کے مردوں کی نالائقی اور جہالت سے تمہارے متعدد حقوق جو خدا کے حکم سے تم کو ملے ہیں اور جن کا انسانیت کی رو سے تمہارا حق ہے، برباد ہو گئے ہیں۔ وہ حق تم کو پھر واپس دلانے کی یہی تدبیر ہے کہ تمہارے لڑکوں کی تعلیم میں کوشش کی جاوے۔ جب کہ وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے وہ چھنے ہوئے حقوق از خود بے مانگے تم کو واپس ملیں گے۔''

آخر میں سرسید نے ہندو اور عیسائی خواتین کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ ''اے میری ہندو اور عیسائی بہنو! تم نے جو اپنی محبت اور وطنی یگانگت سے اپنی مسلمان بہنوں کے ساتھ اس ایڈریس میں اور اس امداد میں جو مدرسۃ العلوم کے غریب طالب علموں کو دی گئی ہے شرکت کی۔ وہ ایک نمونہ تمہاری محبت اور یگانگت کا ہے۔ میں دل سے اس کے لئے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں کہ تم پر بھی خدا کی برکت ہو اور ہر طرح کی ترقی اور خوشی تم کو نصیب ہو۔ آمین۔''

سرسید کی اس تقریر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تعلیمِ نسواں کے مخالف نہیں تھے بلکہ مردوں میں تعلیم عام ہو جانے کے بعد تعلیمِ نسواں پر پوری توجہ دینے کے حق میں تھے۔ سرسید مسلمانوں کی دینی اور تہذیبی شناخت کو باقی رکھنا چاہتے تھے۔

عورتوں کے حقوق کے عنوان سے سرسید احمد خاں تہذیب الاخلاق میں شائع اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''جو لوگ کہ ان خرابیوں کو مذہب اسلام کی طرف نسبت کرتے ہیں یقینی ان کی غلطی ہے، بلکہ ہندوستان میں جس قدر کہ عورتوں کی حالت میں تنزل ہے صرف اس کا باعث احکام مذہب اسلام کی بخوبی پابندی نہ کرنا ہے۔ اگر ان کی پابندی کی جاوے تو

بلاشبہہ یہ تمام خرابیاں دور ہو جاویں۔ معہذا بڑا باعث اس کا ان سویلیائزڈ (Uncivilized)، یعنی نامہذب ہونا مسلمانوں کا ہے۔ مہذب قوموں نے باوجود یہ کہ ان کے ہاں کا قانون نسبت عورتوں کے نہایت ہی ناقص اور خراب تھا، اپنی عورتوں کی حالت کو نہایت اعلیٰ درجے کی ترقی پر پہنچا دیا ہے اور مسلمانوں نے باوجود یہ کہ ان کا مذہبی قانون نسبت عورتوں کے اور ان کی حالت کی بہتری کے تمام دنیا کے قانون سے بہتر اور عمدہ تھا، مگر انہوں نے اپنے نامہذب ہونے سے ایسا خراب برتاؤ عورتوں کے ساتھ اختیار کیا ہے جس کے سبب تمام قومیں ان کی حالت پر ہنستی ہیں اور ہماری ذاتی برائیوں کے سبب اس وجہ سے کہ قوم کی قوم ایک حالت پر ہے، اِلّا ماشاءَ اللہ، اس قوم کے مذہب پر عیب لگاتی ہیں، پس اب یہ زمانہ نہیں کہ ہم ان باتوں کی عزت نہ کریں اور اپنے چال چلن کو درست نہ کریں اور جیسا کہ مذہب اسلام روشن ہے خود اپنے چال چلن سے اس کی روشنی کا ثبوت لوگوں کو نہ دکھائیں۔'' (36)

سرسید عورتوں کی تعلیم کی جانب توجہ دیتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ''علم بلاشبہہ انسان کی حیات ہے اور جہل اس کی موت۔ پس کیا لطف ہے کہ جو خود زندہ دل ہوں اور ان کی عورتیں جو مدارِ عیش و زندگانی ہیں مردہ دل رہیں۔ البتہ اس تحریک سے ہماری یہ غرض نہیں ہے کہ وہ اپنی عورتوں کی وارستگی اور بے پردگی اور بے حیائی بھی پسند کرنے لگیں اور تعلیم یافتہ بنا کر ان کو خود مختار کر دیں اور خود ان کے پابند ہو جائیں۔ بلکہ ہماری صرف یہ غرض ہے کہ باوجود ملحوظ رکھنے ان مراتب کے ان کو تعلیم دینا اور شائستہ بنانا کیسی عمدہ بات ہے اور کیا کچھ ان کی ترقی کا باعث ہے.... پس ہم امید کرتے ہیں کہ جس طرح ہمارے شریف ہم وطنوں نے بعض موقع پر مدارس جاری کیے ہیں اسی طرح خود بھی بشوق و ذوق اس میں شریک ہو کر کل ہندوستانیوں کی ترقی میں سعی و کوشش کریں۔'' (37)

سرسید نے جس وقت اپنی تعلیمی تحریک شروع کی تھی اس وقت ہندوستان میں اسلام تین خطروں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ سب سے بڑا خطرہ عیسائیوں کی طرف سے اسلام پر یلغار تھا۔ اسلام کی تعلیم کی طرح طرح سے برائیاں ظاہر کرتے تھے۔ دوسرا خطرہ سیاسی حالت سے علاقہ رکھتا تھا۔ انگریزوں نے مسلمانوں سے اقتدار

چھینا تھا اس لئے مسلمان ہمیشہ حکمراں قوم کی نگاہ میں کھٹکتے تھے۔ انگریز مسلمانوں کے مذہب کو باغی اور فساد کا سر چشمہ اور امن و عافیت کا دشمن خیال کرتے تھے اور تیسرا سب سے بڑا خطرہ مذہب اسلام کو انگریزی تعلیم سے تھا۔ کیونکہ عیسائی مشنریاں گھر گھر جا کر جبراً تعلیم کے لئے لوگوں سے رابطہ قائم کئے ہوئے تھیں اور ان کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو عیسائی بنانا تھا۔ سرسید چاہتے تھے کہ عورتوں کو مشنری اسکولوں سے الگ رکھا جائے اور جب تک کہ مسلمان لڑکے تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں اس وقت تک ان کو جدید علوم وفنون سے دور رکھا جائے۔ یہی اس وقت کی مصلحت کا تقاضہ بھی تھا۔ شیخ محمد عبداللہ نے دراصل سرسید کے اس خواب کو ہی شرمندۂ تعبیر کیا ہے اور ہندوستان میں تعلیمِ نسواں کے فروغ کو علی گڑھ تحریک کا ہی جز تصور کرنا چاہئے۔

☆☆

حواشی

1۔ الطاف حسین حالیؔ: حیاتِ جاوید: صفحہ 83۔ ترقی اردو بیورو، نئی دلّی 1982ء
2۔ ایضاً
3۔ مولوی ذکاءاللہ: سوانح عمری حاجی محمد سمیع اللہ خاں۔ صفحہ 31 یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ 1997ء
4۔ الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید: صفحہ 152
5۔ لیکچر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس: 1989ء
6۔ سید احمد خاں: سیرتِ فریدیہ۔ مفید عام، آگرہ 1896ء
7۔ الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید: صفحہ 48
8۔ مکمل مجموعۂ لیکچر و اسپیچز: صفحہ 229۔ مرتبہ مولوی امام الدین گجراتی۔ نول کشور پرنٹنگ ورکس، لاہور
9۔ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ: مورخہ 13/جولائی 1868ء
10۔ ایضاً
11۔ محمد سموئیل فلاحی: سرسید اور تعلیمِ نسواں۔ صفحہ 19 تہذیب کراچی، مارچ 2005ء جلد 22 شمارہ 3
12۔ پروفیسر افتخار عالم: سرسید درونِ خانہ، صفحہ 28 ماہنامہ نوائے اخلاق، راولپنڈی۔
اپریل 2006ء جلد 4 شمارہ 6
13۔ پروفیسر شمیم نکہت: آزادیٔ نسواں کی جدوجہد صفحہ 43۔ اردو میں نسائی ادب کا منظر نامہ،
شعبۂ اردو۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
14۔ پروفیسر ثریا حسین: یلدرم آزادیٔ نسواں کے ایک علمبردار۔ صفحہ 52 مجموعۂ مقالات یلدرم سیمینار
1981ء، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
15۔ سونیا نشاط امین: دی ورلڈ آف مسلم ویمنز ان کولونیل بنگال۔ 1939-1876 صفحہ 146 برل
(انٹرنیٹ ایڈیشن)
16۔ کرنل جی ایف آئی گراہم: دی لائف اینڈ ورکس آف سرسید احمد خاں۔ ولیم بلیک وڈ لندن۔ 1885ء

17۔ سرسید احمد خاں: مسافرانِ لندن: صفحہ 124 ناشر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، کراچی 1996ء
18۔ الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید: صفحہ 152، ترقی اردو بیورو، نئی دلی 1982ء
19۔ سرسید احمد خاں: مسافرانِ لندن
20۔ کرنل جی ایف آئی گراہم: دی لائف اینڈ ورکس آف سرسید احمد خاں۔ صفحہ 128
21۔ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ: شمارہ 15/ اکتوبر 1869ء
22۔ تہذہب الاخلاق: جلد تین۔ شمارہ نمبر 1 صفحہ 3
23۔ نفیس بانو: تہذیب الاخلاق۔ تحقیقی وتنقیدی مطالعہ: صفحہ 125، نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ، فیض آباد 1993ء
24۔ پروفیسر ثریا حسین: سرسید اور تعلیمِ نسواں۔ ''خوابوں کا سویرا'' 2005 - 2004ء
25۔ افتخار عالم: سرسید درونِ خانہ:۔ صفحہ 144۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 2006ء
26۔ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی: صفحہ 22 مورخہ 12/ جنوری 1877ء
27۔ افتخار عالم: سرسید درونِ خانہ۔ صفحہ 174 ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
28۔ ایضاً، صفحہ 220
29۔ سررضا علی: اعمال نامہ۔ صفحہ 171، خدا بخش اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ 1992ء
30۔ ایس کے بھٹناگر: ہسٹری آف ایم اے او کالج۔ صفحہ 355، ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی 1969ء
31۔ رشید احمد صدیقی: شیخ اور سید۔ صفحہ 19۔ خواتین نمبر، علی گڑھ میگزین 2001ء
32۔ شیخ محمد عبداللہ: مشاہدات وتاثرات۔ فیمیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن، علی گڑھ
33۔ نفیس بانو: تہذیب الاخلاق تحقیقی وتنقیدی مطالعہ۔ صفحہ 243، نشاط آفسیٹ پریس، ٹانڈہ، فیض آباد 1993ء
34۔ تہذیب الاخلاق: 15 شوال 1290ھ
35۔ الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید: صفحہ 240 - 239
36۔ تہذیب الاخلاق: 5 جمادی الاول 1288ھ
37۔ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی، علی گڑھ: 12/ نومبر 1869ء

باب دوئم

تعلیمِ نسواں کے فروغ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا کردار

سرسید احمد خاں نے اپنی تعلیمی تحریک کو ملک گیر وسعت دینے کے لئے 1886ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ ہندوستان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی رضا کارانہ مسلم تنظیم تھی جس کا مقصد مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے ساتھ قومی اصلاح اور فلاح کے کاموں کے لئے ایک مشترکہ پلیٹ فارم مہیا کرانا تھا۔

محمڈن کالج قائم کر دینے کے بعد سے یہ خیال سرسید کے دماغ میں گردش کر رہا تھا کہ صرف ایک کالج ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ناکافی ہے۔ اس کام کے لئے ملک میں چاروں طرف تعلیمی ادارے قائم کرنے ہوں گے۔ کالج کے قیام کے گیارہ سال بعد یعنی 1886ء میں انہوں نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک انجمن قائم کی جس کا نام محمڈن ایجوکیشنل کانگریس تھا اور آخر کار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہوا۔ اس انجمن کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ ہر سال کسی ایک مقام پر تعلیمی اجلاس ہوا کرے۔ جس میں اس علاقے کے تعلیمی مسائل پر غور ہو اور تعلیم کے فروغ کے لئے مناسب تدبیریں اختیار کی جائیں۔(1)

کانفرنس کے قیام کے وقت اس کے آٹھ بنیادی مقاصد قرار دیئے گئے تھے جس میں مسلمانوں میں یوروپین لٹریچر کو پھیلانا، اس کو وسیع حد تک فروغ دینا اور مسلمانوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے مواقع فراہم کرانا، مسلمانوں نے جن قدیم علوم میں ترقی کی ہے اس کی باقاعدہ تحقیق کرانا اور اس کو عوام تک پہنچانا تاکہ ان کی بے خبری دور ہو۔ نامور عالموں اور مشہور مصنفین اسلام

کی سوانح عمریوں کو لکھوانے کے لئے کوشش کرنا۔ تاریخی واقعات، زمانہ قدیم کی تحقیقات پر رسالے جاری کرنا یا ان موضوعات پر تقریر کے لئے اسکالروں کو آمادہ کرنا، دنیاوی علوم کو فروغ دینے کے لئے رسالے تحریر کرانا یا لیکچر دینے کی تدبیر کرنا اور مسلمانوں کی تعلیم کے لئے جو انگریزی اسکول اور کالج مسلمانوں نے قائم کئے ہیں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور بقدر امکان عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا شامل تھا۔ (2) ہندوستان میں اپنی نوعیت کی یہ واحد مسلم تنظیم تھی جس نے 1947ء سے قبل تک پورے ملک میں ایک تعلیمی ہل چل پیدا کر دی اور اس کی سرگرمیوں کے پیشِ نظر مسلمانوں میں ادارہ سازی کے رجحان کو فروغ حاصل ہوا۔ آزادی سے قبل کے مسلم تعلیمی اداروں کی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ یہ تمام ادارے سر سید یا ان کی تحریک سے وابستہ سرگرم اور فعال مسلمانوں نے قائم کئے تھے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے تعلیمِ نسواں کے میدان میں بھی جو خدمات پیش کی ہیں وہ مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ کا زرّیں باب ہے۔ مسلم ایجوکیشنل کے پہلے اجلاس میں ہی جو 27/دسمبر سے 29/دسمبر 1886ء کو سر سید کے دیرینہ رفیق مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر کی صدارت میں محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ میں منعقد ہوا تھا(3) اس میں اس تنظیم کی شاخیں ہر شہر اور قصبہ میں قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا گیا تھا کہ ہر ضلع میں مسلم بستیوں کے مختصر حالات کے ساتھ ساتھ ان کی مردم شماری کرائی جائے اور لڑکیوں کے سرکاری اسکولوں کے ساتھ ساتھ مشنریوں کے زیرِ انتظام چلائے جا رہے لڑکیوں کے اسکولوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی جائیں تا کہ ان اعداد و شمار کی روشنی میں مسلمان مستقبل کا عملی منصوبہ تیار کر سکیں اور وہ اپنی ناخواندگی اور پسماندگی کو دور کرنے کے لئے اقدامات کر سکیں۔

محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا تیسرا اجلاس 27/دسمبر سے 29/دسمبر 1888ء کو لاہور میں خان بہادر مولوی محمد برکت اللہ خاں صاحب، جنرل سکریٹری انجمنِ اسلامیہ پنجاب کی زیرِ نگرانی اور سردار محمد حیات خاں صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا تھا جس میں پہلی مرتبہ لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق ایک قرارداد شیخ خیر الدین نے پیش کی تھی اور اس کی تائید خلیفہ عماد الدین، ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس نے کی تھی۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ ''محمڈن ایجوکیشنل کانگریس اس

امر پر اتفاق کرتی ہے کہ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لئے اہلِ اسلام زنانہ مکتب جاری کریں جو مذہب اسلام اور طریقۂ شرفائے اہلِ اسلام کے مطابق اور اس کے مناسب ہو"۔ اس اجلاس میں تقریباً چودھا سو مندوبین نے حصہ لیا تھا جس میں 288 ممبران کانفرنس بھی شامل تھے۔ جن میں سر سید احمد خاں، مسٹر تھیوڈر بیک، پرنسپل مدرسۃ العلوم علی گڑھ، محمد اکرام اللہ خاں، رئیس دہلی، راجہ جہانداد خاں، خواجہ ظہور احمد شاہ، شیخ محمد شاہ، حافظ غلام محی الدین وکیل، انجمن حمایتِ اسلام لاہور، محمد حسن خاں وکٹوریہ جوبلی اسکول جھنگ، منشی شمس الدین اور سید میر حسن تھے۔

یہی وہ اجلاس تھا جہاں سب سے پہلے شیخ محمد عبداللہ نے سر سید احمد خاں کو دیکھا۔ وہ اپنے استاد حکیم مولانا نورالدین کے ہمراہ اس کانفرنس کے جلسہ میں گئے تھے۔ سر سید کی اس تحریک سے متاثر ہوکر علی گڑھ کی طالب علمی اختیار کی اور اب ان کا شمار مسلم تعلیم نسواں کے معمارِ اول میں کیا جاتا ہے۔

جو لوگ سر سید پر تعلیمِ نسواں کے مخالف ہونے کا الزام لگاتے ہیں وہ شاید اس تاریخی حقیقت سے واقف نہیں کہ سر سید کی موجودگی میں ہی تعلیمِ نسواں کا پہلا ریزولیشن پاس ہوا تھا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا چھٹا اجلاس 1891ء کو مرزا غالب کے دیرینہ رفیق نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے صاحبزادے نواب محمد اسحاق خاں صاحب کی صدارت میں باہتمام سر سید احمد خاں علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی دوسری قرارداد بھی تعلیمِ نسواں سے متعلق تھی جس کو خواجہ غلام الثقلین نے پیش کیا اور کرامت حسین ڈگری کالج لکھنؤ کے بانی مولوی سید کرامت حسین نے اس کی تائید کی۔ اس قرارداد میں کہا گیا کہ "اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت میں مردوں کی تعلیم کے ساتھ عورتوں کی تعلیم میں بھی کوشش کرنی لازمی ہے۔ کیونکہ قوم کی اصلی ترقی زیادہ تر اسی پر منحصر ہے۔ یہ تعلیم ایسی ہونی چاہئے کہ عورتوں کی مذہبی، علمی اور اخلاقی زندگی میں ترقی ہوتا کہ ان کی مبارک تربیت سے آئندہ نسلیں فائدہ اٹھائیں۔"

کلکتہ ہائی کورٹ کے فاضل جج آنریبل جسٹس سید امیر علی کی صدارت میں 1899ء کو آل انڈیا محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی جس میں رابندر ناتھ ٹیگور کے خاندان کے ایک رکن نے مہمان نوازی کے فرائض انجام دیتے ہوئے اپنا وسیع محل اجلاس کے لئے دیا۔

اس اجلاس میں صوبہ بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر سر جان وڈ برن کے علاوہ مہاراجہ قاسم بازار، مسٹر ٹی ایم گھوش، جسٹس گرو داس بنرجی، مسٹر کینڈی کمشنر بردوان، مسٹر ڈیوک مجسٹریٹ ہاوڑہ، کرنل سردار محمد اسمٰعیل خاں سفیر کابل بھی تشریف فرما تھے۔ نظام حیدر آباد میر محبوب علی خاں صاحب بھی کلکتہ میں موجود تھے اور مدرستہ العلوم کے ٹرسٹیوں نے نواب محسن الملک کی قیادت میں میر محبوب علی خاں سے ملاقات کر کے مدرستہ العلوم کے ترقیاتی کاموں میں ان کی معاونت پر شکریہ ادا کیا۔

کلکتہ کا یہ اجلاس اس اعتبار سے بھی تاریخی اہمیت کا حامل بن گیا کہ اسی سال تعلیم نسواں کے متعلق ایک جداگانہ شعبہ کا وجود عمل میں آیا اور پورے ملک میں تعلیم نسواں کے فروغ کے لئے ریاستی کمیٹیاں قائم کرنے پر تبادلۂ خیال کیا گیا اور قرارداد میں کہا گیا کہ "اس کانفرنس کی رائے ہے کہ ہر صوبہ کے دارالخلافہ اور علمی ترقی کے تمام مراکز میں احکامِ اسلام اور مسلمان شریف خاندانوں کے رسم و رواج کے مطابق زنانہ مدارس جاری کئے جائیں اور یہ کام یکم رجنوری 1900ء سے تین برسوں کے اندر تکمیل کو پہنچ جائے اور یہ کلکتہ کمیٹی کی طرح ہر صوبہ میں اپنے اپنے صوبے کے زنانہ مدارس کی ضبط و نگرانی اور رہنمائی کے لئے پراونشل کمیٹیاں قائم کی جائیں اور یہ کہ اسلامی احکام کے مطابق ہر جگہ کے مستند علماءٔ کی مدد سے نصابِ تعلیم تیار کیا جائے۔" اس تجویز کے محرک خان بہادر شجاعت علی بیگ تھے جبکہ نواب محسن الملک نے اس قرارداد کی تائید کی تھی۔

نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کی صدارت میں 1900ء میں رامپور میں منعقد چودھویں اجلاس میں مسلم لڑکیوں کی ضرورت کے مطابق نصابِ تعلیم مرتب کرنے سے متعلق ایک قرارداد چودھری خوشی محمد خاں نے پیش کی جس کی تائید صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے کی۔ اس کانفرنس کی تیسری قرارداد میں کہا گیا کہ "اس کانفرنس کی رائے میں مسلمان لڑکیوں کی توسیع معلومات و ترقی تہذیب کے لئے ضروری ہے کہ علاوہ دینیات کے ابتدائی حساب، تاریخ، جغرافیہ، طبعیات و اخلاق کی بھی تعلیم ہو اور اس غرض کے واسطے سہل کتابیں تصنیف کی جائیں جو مسلمان لڑکیوں کی ضرورت کے موافق ہوں۔"

جنوبی ہندوستان کی سب سے ترقی یافتہ ریاست مدراس میں کانفرنس کا پندرھواں اجلاس 1901ء میں مدراس ہائی کورٹ کے جسٹس باڈم کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں قرار

داد پاس کی گئی کہ ”مسلمانان مدراس میں تعلیم نسواں کو استحکام اور تقویت دینے کے لئے ضروری ہے کہ ہابرٹس گرلس ہائی اسکول کو از سر نو ترتیب دیا جائے اور شہر مدراس کے شمالی حصہ کی ضروریات پورا کرنے کے لئے ایک جدید مدرسہ قائم کیا جائے۔“ اس تجویز کو میر سلطان محی الدین نے پیش کیا اور مولوی فخر الدین نے تائید کی۔

سر آغا خاں کی صدارت میں 3/فروری 1902ء میں دلی میں منعقدہ اجلاس میں ممبروں کی تعداد 10361 اور وزیٹروں کی تعداد 310 تھی اور پہلی مرتبہ بڑی تعداد میں انگریزوں نے بھی شرکت کی جن میں سر مائیکل ہکس وزیر خزانہ انگلستان، لارڈ ڈیمبروک ممبر پارلیامنٹ، سر ایم ایم بھاونگری ممبر پارلیامنٹ، لارڈ کچنر کمانڈر انچیف افواج ہند، گورنر ممبئی اور مدراس، لیفٹیننٹ گورنرس ممالک متحدہ اور پنجاب کے علاوہ انگریز خواتین بھی شامل ہوئیں۔ دلی کے اسی اجلاس میں شیخ محمد عبداللہ کو تعلیم نسواں کے شعبہ کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔

1903ء کا اجلاس مسلم تعلیم نسواں کی بیداری کے لئے بہت ہی فالِ نیک ثابت ہوا۔ ممبئی میں واقع انجمنِ اسلام کی خوشنما عمارت کے صحن میں منعقد اس اجلاس کی صدارت جسٹس بدرالدین طیب جی جج ہائی کورٹ ممبئی نے فرمائی۔ اس اجلاس میں نواب محسن الملک، علامہ نذیر احمد، علامہ شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالؔی اور مولانا سید شاہ سلیمان پھلواری نے بھی خطاب کیا اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تاریخ میں پہلی مرتبہ عورتوں کو چلمن کے پیچھے سے کانفرنس کی کارروائی سننے یا دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اس موقعہ پر پہلی مرتبہ تعلیمی نمائش کا بھی انعقاد کیا گیا جس میں نقشے، تصاویر، گلوب اور عورتوں کی بنائی ہوئی چیزوں کو بھی رکھا گیا۔ چونکہ اپنی نوعیت کی یہ پہلی تعلیمی نمائش تھی اس لئے لوگوں نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور ممبئی کے گورنر لارڈ ولنگٹن نے اپنی تقریر میں نمائش کا خصوصی طور پر تذکرہ کیا۔ اس اجلاس میں بصارت سے محروم طلباً کو بھی تعلیم حاصل کرتے ہوئے دکھایا گیا۔ کنڈر گارٹن کے طریقۂ تعلیم کو بھی پہلی مرتبہ مندوبین نے دیکھا۔ ہندوستان میں اس وقت تک مسلمان اس کے مشاہدے سے بے خبر اور لاعلم تھے۔ اس کا انتظام انجمن اسلام کے مدرسہ میں کیا گیا۔ اس کانفرنس میں مسلم استانیوں کو تیار کرنے کے لئے نارمل اسکول کے قیام کو بھی منظوری دی گئی تاکہ یہ مسلم خواتین مسلم لڑکیوں کو تعلیم دے سکیں۔ بدقسمتی سے مسلمانوں میں آج

بھی ایسے تربیتی اداروں کا فقدان ہے جہاں نوجوانوں کو معلّمی کے پیشہ کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور ہندوستان کے مسلمان ابھی تک طریقۂ تعلیم کو ایک فن کے طور پر تسلیم نہیں کر پائے ہیں۔ جب اچھے اساتذہ ہی نہیں ہوں گے تو اچھے اسکول اور طالب علم کہاں سے پیدا ہوں گے؟

شیخ محمد عبداللہ بمبئی کے اس اجلاس کے متعلق مزید معلومات فراہم کرتے ہیں کہ ''وہ زمانہ عجیب وغریب تھا کہ شمالی ہند کے بعض مسلمانوں کو یہ بات بھی ناگوار تھی کہ عورتیں چلمنوں کے پیچھے بیٹھ کر جلسہ کی تقریریں سنیں۔ چنانچہ مولانا بشیر الدین صاحب ایڈیٹر ''البشیر'' نے اپنے اخبار میں عورتوں کے اس طور پر شریک ہونے پر اعتراض کیا اور کہا کہ میں دیکھ رہا تھا، عورتیں چلمنوں میں سے جھانک رہی تھیں اور مجھے ان کی آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔

میں نے اس کا جواب دیا کہ آپ شرع کے احکام کو اچھی طرح دیکھ لیجئے کہ آپ اس معاملے میں ملزم یا گنہگار ٹھہرتے ہیں یا عورتیں؟ سب سے اول یہ بات ہے کہ میں بھی اس جلسہ میں بیٹھا تھا لیکن میں ٹکٹکی باندھے چلمنوں کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ آپ کو کیا حق تھا کہ آپ اپنی آنکھیں اوپر ہی لگائے رکھیں۔

دوسری یہ بات ہے کہ شرع کا حکم ہے کہ جب عورت تمہارے سامنے آجائے تو تم اپنی آنکھیں نیچی کر لو اور بجائے اس کے کہ آپ اپنی آنکھ نیچی کر لیتے، آپ گھور گھور کر عورتوں کی چلمنوں میں سے چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھا کئے۔''

اس جلسہ میں سب سے اول بمبئی کی تعلیم یافتہ خواتین سے تعارف کا اتفاق ہوا۔ ان خواتین میں سے تین تو جسٹس بدرالدین مرحوم کی بیٹیاں تھیں اور دو فیضی صاحب کی بیٹیاں زہرہ فیضی اور عطیہ فیضی تھیں۔ ان کے علاوہ اور دو تین تعلیم یافتہ بیگمات بمبئی کے روشن خیال اور تعلیم یافتہ خاندان کی تھیں۔'' (4)

1904ء کا سال ہندوستان میں مسلم تعلیم نسواں کی تحریک کے لئے سنگِ میل ثابت ہوا۔ اسی سال شیخ محمد عبداللہ نے اپنی ادارت میں رسالہ ''خاتون'' جاری کیا اور ایم اے او کالج کے پرنسپل مسٹر تھیوڈور ماریسن کی صدارت میں اسی سال لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سترھواں اجلاس منعقد ہوا اور پہلی مرتبہ تعلیم نسواں کی تحریک کو کسی ریاست کی طرف سے سرپرستی

حاصل ہو سکی۔ تعلیمِ نسواں کے اجلاس کی صدارت لاہور کے بیرسٹر شاہ دین نے کی۔ اس اجلاس میں علی گڑھ میں لڑکیوں کا مدرسہ قائم ہونے کی تجویز منظور کی گئی۔

اس اجلاس میں کانفرنس کے سکریٹری نواب محسن الملک نے سب سے پہلے یہ خوش خبری دی کہ نواب سلطان جہاں بیگم والیٔ ریاست بھوپال نے تعلیمِ نسواں کے فروغ کے لئے علیگڑھ کالج کو عطیہ دینا منظور کرلیا ہے۔ یہ فرمان 24 ہزار روپیہ کا تھا اور اس طرح اس اجلاس میں پہلی مرتبہ تعلیمِ نسواں کے لئے 34 ہزار 250 روپیہ کا چندہ وصول ہوا۔ اس اجلاس میں جو لکھنؤ کی بارہ دری میں منعقد ہوا تھا اس کے متصل ایک خوبصورت شاہی عمارت میں خواتین ہند کی صنعت و حرفت کی دوسری نمائش کا اہتمام کیا جس میں کثرت کے ساتھ مسلم خواتین کی دستکاری کے نمونے سلیقہ کے ساتھ سجائے گئے تھے۔ نمائش کے موقعہ پر مختلف اصحاب نے تقریباً ڈھائی سو روپیہ کے انعامات دے کر تحریکِ نسواں میں اپنی شمولیت کا عملی ثبوت پیش کیا۔

نواب محسن الملک کے انتقال کے بعد نواب وقار الملک کی سکریٹری شپ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس 1907ء میں مدرسہ اسلامیہ کراچی میں منعقد ہوا جس کی صدارت اردو کے مشہور شاعر اور سرسید کے سوانح نگار خواجہ الطاف حسین حالؔی نے کی۔ مولانا حالؔی نے اپنے خطبۂ صدارت میں سندھ کے مسلمانوں کی تعلیمی پستی پر وہاں کے کچھ اعداد و شمار اور واقعات کے ساتھ روشنی ڈالی۔ انہوں نے مسلمانوں کی حالت پر ایک پر اثر نظم بھی پڑھی۔

زمانہ نام ہے میرا تو میں سب کو دکھا دوں گا
کہ جو تعلیم سے بھاگیں گے نام ان کا مٹا دوں گا

اسی اجلاس میں نواب وقار الملک، سید محمد حسن وزیر ریاست پٹیالہ، ممبئی کے مشہور تاجر سر آدم جی پیر بھائی، جسٹس شاہ دین، میجر سید حسن بلگرامی اور مسٹر علی امام بیرسٹر نے بھی شرکت فرمائی۔ اس اجلاس میں سندھ کے مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ایسا لٹریچر تیار کرانے کا فیصلہ کیا گیا جس میں مذہبی اور اخلاقی مضامین ہوں۔

1909ء میں راجہ محمود آباد سر علی محمد خاں کی صدارت میں اس کانفرس کا اجلاس رنگون میں منعقد ہوا جس میں پنجاب، بنگال، بہار، مدراس، ممبئی، حیدرآباد، آسام غرض ملک کی ہر سمت

سے ڈھائی سو مندوبین ہزار ہا میل کا بری اور بحری سفر کر کے رنگون آئے۔ اس اجلاس میں صوبہ برما کے لیفٹیننٹ گورنر مسٹر ہربرٹ وائٹ نے اعلان کیا کہ جو مفید تجاویز مسلمانانِ برما کی تعلیمی ترقی سے متعلق پیش کی جائیں گی گورنمنٹ اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے گی۔

جناب عبداللہ بن یوسف علی، پرنسپل، اسلامیہ کالج، لاہور کی صدارت میں 1910ء میں چوبیسواں اجلاس ناگپور میں منعقد ہوا۔ اپنی صدارتی تقریر میں انہوں نے کہا کہ ''اگر صرف مردوں کا فائدہ سمجھا جائے تو ذکور اور اناث کی مساوات تمدنی ترقی کے لئے ایک ضروری شرط ہے۔ ہمارے بھائیوں کی اور ہماری آئندہ نسلوں کی بہبودی اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری مائیں، بہنیں، بیویاں اور بیٹیاں علم اور اجتماعی تجربہ میں اگر ہم سے زیادہ نہ ہوں تو مساوی ضرور ہوں۔'' (5)

نواب عمادالملک بہادر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کی صدارت میں 4ر دسمبر 1911ء کو دلی میں دربار تاجپوشی کے موقع پر منعقد ہوا۔ شعبۂ تعلیم نسواں کی صدارت نواب سلطان جہاں بیگم نے فرمائی اور ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ ایک عوامی جلسہ میں عوام کے دوش بدوش بیٹھ کر ایک فرماں روا اور والیٔ ملک کی حیثیت سے قوم کی بہبودی کے مسائل پر انہوں نے حصہ لیا۔

میجر سید حسن بلگرامی کی صدارت میں لکھنؤ کے بارہ دری میں 1912ء میں منعقد کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں ایک مرتبہ پھر زنانہ نمائش کا اہتمام خصوصیت کے ساتھ کیا گیا جس کا افتتاح لیفٹیننٹ گورنر سر جیمس مسٹن کی بیگم نے کیا۔

لاہور ہائی کورٹ کے جج جناب شاہ دین کی صدارت میں 1913ء میں آگرہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ستائیسواں اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے جسٹس شاہ دین نے تعلیم نسواں کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ ''کوئی قومی تعلیم کی تجویز ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مکمل نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ اس میں مستورات کی تعلیم سے متعلق طریقہ ہائے جدیدہ پر ایک ترقی پذیر اسلامی جماعت کی خاص ضرورتوں کو مدِ نظر رکھ کر کافی انتظام نہ کیا گیا ہو۔''

راولپنڈی میں منعقد 1914ء میں اٹھائیسویں اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے عالی

جناب مولوی رحیم بخش، پریسیڈینٹ کونسل، بھاولپور نے تعلیم نسواں سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''گھر جہاں بچے پرورش اور تربیت پا کر مرد اور عورت بنتے ہیں۔ اس طاقت کے لحاظ سے اچھے یا برے ہوتے ہیں جو وہاں حکمراں ہوتی ہے اور جو طاقت گھروں پر حکمرانی کرتی ہے وہ ماں ہوتی ہے۔ سب سے پہلی اور سب سے بڑی مثال ہوتی ہے اور یہ مثال ماں کی ہوتی ہے جو ہمیشہ بچوں کے پیشِ نظر ہوا کرتی ہے اور بچے کی زندگی پر اس کا ہی اثر پڑا کرتا ہے۔ بچپن کے زمانے میں جو بہت اثر پذیر تقلید کا زمانہ ہوتا ہے، یہ ماں ہی کا سانچہ ہے جس میں روزانہ بچہ ڈھلتا رہتا ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ میرا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ رنج یا راحت، روشن دماغی یا جہالت، نہ آج طبیعت اور عادات کے پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونے کا انحصار جن کے ساتھ پرورش پاتا ہے کہ ایک بڑی حد تک ان اختیارات کے استعمال پر ہوتا ہے جو عورت کو گھر کی خاص حیثیت میں حاصل ہوتے ہیں۔ عورتیں ہمارے نیک و بد اور رنج و راحت کی شریک حال ہوا کرتی ہیں۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو ہم پر مذہباً، اخلاقاً اور مجلسی قواعد کی رو سے واجب اور لازم ہے کہ ہم ان کو تعلیم دیں اور اس قابل بنائیں کہ زندگی میں وہ ہمارے لئے ایک رفیق اور ہمدم ثابت ہوں۔''

ایک جلسہ سندھ کی ریاست خیر پور کے وزیرِ اعظم شیخ صادق علی کی دعوت پر 1919ء میں منعقد ہوا جس کا اہتمام خیر پور ریاست کے وزیر خان بہادر مولوی محمد ابراہیم نے کیا اور مولوی سر رحیم بخش پریسیڈینٹ کونسل بھاولپور نے صدارت فرمائی۔ اس جلسہ میں مسٹر محمد ایوب خاں بھی شریک ہوئے جو قیامِ پاکستان کے بعد اس کے صدر بھی رہے۔ اس اجلاس میں سندھ کی مسلم لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ضروری انتظامات کئے جائیں اور مسلم لڑکیوں کی تعلیم کے لئے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک کمیٹی قائم کی جائے اور مسلم استانیوں کی تعلیم کے لئے زیادہ فیاضانہ طور پر وظائف قائم کئے جائیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے بعد 1922ء میں پہلے تقسیمِ اسناد کے جلسہ کے موقعہ پر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس بھی علی گڑھ میں ہونا قرار پایا۔ کانفرنس کا یہ جلسہ میاں فضل حسین وزیرِ تعلیمات پنجاب کی صدارت میں منعقد ہوا اور نواب مزمل اللہ خاں صاحب

کو استقبالیہ کمیٹی کا صدر مقرر کیا گیا۔ اس جلسہ میں ماہرینِ تعلیم کی بڑی تعداد شریک ہوئی اور مولانا سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں کی تقریریں بہت پسند کی گئیں۔

اس اجلاس میں شیخ محمد عبداللہ نے تعلیمِ نسواں سے متعلق ایک اہم تجویز پیش کی جس کی تائید میرٹھ کے نواب محمود علی خاں نے کی۔ اس قرارداد میں لڑکیوں کی لازمی تعلیم کی حمایت کی گئی اور مسلمانوں کے جن فرقوں میں پردے کی پابندی نہیں تھی ان کی لڑکیوں کے لئے اسکولوں میں جا کر تعلیم حاصل کرنے کی حمایت کی گئی۔ ساتھ ہی مسلمانوں کے جن فرقوں میں پردے کی پابندی ہے ان کی لڑکیوں کو بھی دس سال کی عمر تک اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کی پرزور حمایت کی گئی اور ان کے لئے پردے کی سواریوں کا انتظام کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ پہلی مرتبہ بزرگ استادوں کو لڑکیوں کی تعلیم دلانے کی بات بھی قرارداد میں کہی گئی۔

ساتھ ہی مسلم یونیورسٹی میں ٹیچرس ٹریننگ کالج اور انجینیر نگ کالج شروع کرنے کی قرارداد اتفاقِ رائے سے منظور کی گئی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے روحِ رواں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی صدارت میں 1923ء کا سالانہ اجلاس بھی علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ اس کانفرنس میں ایک عظیم الشان تعلیمی نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا اور ماں کی گود سے قبر تک کی ہر ضروری چیز کو پیش کیا گیا۔ مشتاق منزل میں بچہ کی پیدائش اور زچہ کی حفاظت سے متعلق نقشے، تصاویر اور ماڈل فراہم کئے گئے تھے اور ایک لیڈی ڈاکٹر تصاویر کے حوالے سے ہر بات کو سمجھاتی تھی اور اس طرح تعلیمِ نسواں کی ضرورت کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ ممبئی کے اجلاس میں جہاں عورتوں کو چلمن کے پیچھے سے کارروائی میں حصہ لینے کی اجازت دی گئی تھی اب تعلیم کے ساتھ ساتھ حفظانِ صحت جیسے موضوع بھی مسلمانوں کی کشش کا موضوع بننے لگے۔ یہ بہت بڑی تبدیلی اور انقلاب کا پیش خیمہ تھی۔

اس تعلیمی نمائش میں ہاکی، کرکٹ، ٹینس، فٹ بال اور اسکاوٹنگ کے ساتھ ساتھ علمِ فلکیات اور طبعیات کے مسائل کو حل کرنے کے لئے جو آلات ایجاد ہوئے تھے وہ بھی نمائش کی زینت بنائے گئے۔ ہندوستان میں تعلیم سے متعلق اپنی نوعیت کی یہ پہلی نمائش تھی اور نمائش کے سامان

میں بڑا حصہ ایسی اشیائ کا تھا جن کو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں خود اپنے ہمراہ انگلستان سے لے کر آئے تھے۔

ہندوستان کے مشہور بیرسٹر مسٹر محمد علی جناح (جو بعد میں قائدِ اعظم کہلائے اور پاکستان کے نظریہ کے بانی قرار دیئے گئے۔) کی درخواست پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس 1924ء کو بمبئی کے گلوب سنیما ہال واقع سینڈ ہرسٹ روڈ پر منعقد ہوا اور اپولو و تاج محل ہوٹل میں مہمانوں کو ٹھہرایا گیا۔ پانچ ہزار افراد پر مشتمل دو عوامی جلسوں کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اس جلسہ میں مسٹر ایم سی چھاگلا (سابق وزیرِ تعلیم حکومتِ ہند)، مولوی رفیع الدین بیرسٹر پونا، مسٹر ضیائ الدین برنی وغیرہ نے بھی تجاویز پیش کیں۔ اس جلسہ میں پہلی مرتبہ بمبئی یونیورسٹی اور ملک کی دوسری یونیورسٹیوں میں مسلم طالبات کے لئے اعلیٰ امتحانات میں پرائیویٹ امیدوار کے طور پر امتحان دینے کی اجازت دینے کا مطالبہ کیا گیا اور اس فیصلے پر سب سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے عمل کیا اور آج بھی لڑکیوں کو پرائیویٹ امتحان دینے کی اجازت حاصل ہے۔

مدراس ہائی کورٹ کے سابق جج سر عبدالرحیم کی صدارت میں 1926ء کو دلّی میں کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا۔ یہ کانفرنس اس سے قبل دلّی میں تین اجلاس کر چکی تھی۔

اس کانفرنس میں مولوی سید طفیل احمد منگلوری نے دو ہزار سے زائد کی آبادی میں ایک پردہ پرائمری اسکول قائم کئے جانے کا مطالبہ کیا۔ اس تجویز کی تائید ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں نے کی۔ اس کانفرنس میں ایک اور قرارداد پاس کی گئی جس میں کہا گیا کہ چونکہ ہندوستان کا مروجہ پردہ عورتوں کی ترقی کو مانع ہے۔ جس کی طرف حکیم محمد اجمل خاں صاحب ندوۃ العلمائ نے کانپور کے جلسہ میں توجہ دلائی تھی لہٰذا یہ کانفرنس علمائے کرام کو صدر صاحب موصوف کی اس تحریک پر توجہ دلاتی ہے کہ شرعی احکام کو پیشِ نظر رکھ کر ایسی صورت میں تجویز کریں کہ عورتیں برقع اوڑھ کر مکانات کے باہر جا سکیں اور ان کی لڑکیاں تعلیم سے استفادہ کریں۔ اس قرارداد کے محرک سید احمد کاظمی وکیل سہارنپور تھے جبکہ مولوی محمود احمد عباس نے اس کی حمایت کی تھی۔

قرارداد پیش کرتے ہوئے محرک نے کہا تھا کہ جب تک مروجہ غیر شرعی پردہ قائم ہے، عورتوں کی تعلیم نہیں ہو سکتی اور جب تک عورتوں کی تعلیم نہیں ہوگی، مردوں کی تعلیم بھی اچھی طرح

نہ ہوسکے گی۔ لہٰذا مروجہ پردہ میں ترمیم کی جائے اور دوسرے اسلامی ممالک کی حالت کو پیشِ نظر رکھ کر شرعی پردہ کو رواج دیا جائے۔

علی گڑھ تحریک کے سرگرم کارکن سر شیخ عبدالقادر کی صدارت میں 1927ء میں کانفرنس کا چالیسواں اجلاس ایک مرتبہ پھر مدراس میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں خواتین بھی کثرت کے ساتھ تشریف لائیں۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر انصاری، صدر انڈین نیشنل کانگریس، سر ابراہیم رحمت اللہ، صدر انڈین انڈسٹریل کمرشیل کانگریس، مسٹر نٹراجن صدر انڈین سوشل کانفرنس نے بھی حصہ لیا اور شعبہ اصلاح تمدن و تعلیم نسواں کی صدارت جسٹس سر شاہ سلیمان، جج ہائی کورٹ الہ آباد نے فرمائی اور اس کانفرنس میں سات قراردادیں مسلم تعلیمِ نسواں سے متعلق منظور کی گئیں۔ کانفرنس کی تاریخ میں مسلم لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق اتنی قراردادیں کبھی بھی منظور نہیں کی گئی تھیں اور اس طرح مسلم لڑکیوں کی تعلیم مسلمانوں کے ایجنڈے میں شامل ہوگئی تھی۔

انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ''کوئی قوم اپنے عروجِ ترقی تک نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ اس کی آبادی کا حصہ نسواں ذہنی اور جسمانی نشو ونما کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ حاصل نہ کرے۔ انہوں نے کہا کہ اب ہندوستانی عورتوں کو قانونی مجالس کے انتخاب کے لئے رائے دینے کا حق حاصل ہوگیا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ حق جو نہیں دیا گیا ہے کام میں لایا جاوے اور وہ اپنے ملک کے مشوروں میں مناسب حصہ لیں تو آپ کو چاہئے کہ تعلیمِ نسواں کے متعلق پرزور تدبیریں اختیار کریں اور جو خرچ اب تک اس کے لئے کرتے رہے ہیں اس سے بہت زیادہ خرچ برداشت کریں۔''

اس کانفرنس میں طے پایا کہ شہر مدراس اور جنوبی اضلاع کا ہربرٹ ٹریننگ اسکول سیکنڈری گریڈ کی مسلم استانیوں کو ضرورت کے لحاظ سے تیار نہیں کرتا۔ لہٰذا گورنمنٹ سے اپیل کی جائے کہ گنٹور اور ترچناپلی کے مسلم استانیاں تیار کرنے والے ابتدائی گریڈ کے ٹریننگ اسکولوں کو ترقی دے کر سیکنڈری گریڈ کا بنا دیا جائے۔ ساتھ ہی گورنمنٹ سے یہ بھی درخواست کی جائے کہ شمالی سرکار مسلم استانیوں کے لئے ابتدائی گریڈ کے ٹریننگ اسکول قائم کرے۔

بیرسٹر مسٹر زین الدین نے ایک قرارداد پیش کر کے مدراس کارپوریشن سے اپیل کی کہ

وہ مسلمان لڑکیوں کے لئے مفت اور لازمی تعلیم کا قانون وضع کرے اور جب تک قانون نہ بنے اس وقت تک ان کے لئے ابتدائی مدارس قائم کرے جن میں تعلیم پانا ان کی مرضی کے مطابق ہو۔ ساتھ ہی مسلمان لڑکیوں کے لئے سرکاری خرچ سے دوپہر کے کھانے اور مناسب سواریوں میں ان کے لانے لے جانے اور ان علاقوں کے اوقاتِ مدرسہ میں ان کی مذہبی تعلیم کا بندوبست کرنے کا بھی مطالبہ کیا گیا۔

مسلمانوں میں تعلیمِ نسواں کو رواج دینے کی غرض سے مسلم گرلس اسکولوں میں سند یافتہ مسلم ہیڈ معلّمہ کا تقرر کرنے کا بھی مطالبہ کیا گیا۔

الہ آباد ہائی کورٹ کے جج سر شاہ محمد سلیمان کی صدارت میں 1928ء میں اجمیر میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس اسلامیہ معینہ ہائی اسکول کے عثمانیہ ہال میں منعقد ہوا اور رائے بہادر سیٹھ ٹیکم چند نے اپنی وسیع کوٹھی مہمانوں کے قیام کے لئے عنایت فرمائی۔ اس اجلاس میں میسور یونیورسٹی، ڈھاکہ یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے نمائندے بھی موجود تھے۔ اس کانفرنس میں تعلیمِ نسواں کو مسلمانوں میں مقبول بنانے اور ان لڑکیوں کی تعلیمی دشواریوں کو دور کرنے کے لئے لڑکیوں کی تعلیم ان کی ضرورتوں کے مطابق ہو اور نصابِ تعلیم افادہ کے اصول پر تجویز کرنے، نجی طور پر قائم ہونے والے زنانہ مدارس کے لئے تربیت یافتہ استانیاں فراہم کرنے، پردہ نشین مستورات کے لئے لوکل بورڈ کی جانب سے ایسا انتظام کرنے جس سے ان کی جسمانی تفریح کے علاوہ اصول حفظانِ صحت، فرسٹ ایڈ، تیمارداری اور دوسرے کام سیکھنے کا موقعہ فراہم کرایا جائے جو امورِ خانگی کے لئے مفید ہوں۔ ساتھ ہی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ذریعۂ تعلیم انگریزی کو لازمی مضمون قرار نہ دیا جائے۔

راجستھان میں مسلم لڑکیوں کی بڑھتی ہوئی ضرورت کے مطابق اس صوبہ میں ایک مکمل مسلم گرلز اسکول قائم کرنے کے ساتھ ساتھ حکومتِ ہند سے تعلیمِ نسواں کے فروغ کے لئے دو لاکھ روپیہ کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ ساتھ ہی نواب ٹونک سے اپیل کی گئی کہ وہ اس علاقے کی تعلیمی پستی کو دور کرنے کے لئے تعلیم کا بجٹ دس فیصد کردیں اور تعلیم نسواں کا بھی مناسب بندوبست کریں۔

مسلمانوں کی تعلیمی صورتِ حال سے سب سے پسماندہ علاقہ روہتک میں کانفرنس کا

اجلاس 1931ء کو زیر صدارت جناب سید رضا علی منعقد ہوا۔ اس وقت اس ضلع میں مسلمانوں کی تقریباً ڈیڑھ لاکھ آبادی میں دس مسلمان بھی تعلیم یافتہ نہیں تھے جبکہ روہتک ایک زمانہ میں علم وفن کا مرکز تھا اور سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ محدث کے اسلافِ کرام یہاں آباد ہوئے تھے۔

اس کانفرنس میں تعلیمِ نسواں سے متعلق قرارداد شوکت حسین زیدی وائس پرنسپل عربک کالج دلی نے پیش کی اور دلی کی شاہی جامع مسجد کے امام مولانا سید عبداللہ بخاری کے والد بزرگوار شمس العلمأ مولوی سید احمد امام جامع مسجد دہلی نے قرارداد کی حمایت کی۔ اس کانفرنس میں مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا کہ وہ لڑکیوں کو زیادہ تعداد میں خواندہ بنانے کے لئے انہیں وظائف دیں۔ ساتھ ہی مسلم اساتذہ کو معقول تعداد میں مقرر کرنے اور مسلمان لڑکیوں کی مذہبی واخلاقی تعلیم لازمی طور پر مسلم استانیوں کے سپرد کئے جانے کا بھی مطالبہ کیا گیا۔

بھاول پور ریاست کے وزیرِ تعلیم لیفٹیننٹ کرنل مقبول حسن قریشی کی صدارت میں 1932ء میں لاہور میں منعقد کانفرنس میں پہلی مرتبہ ایک خاتون پرنسپل خدیجہ بیگم صاحبہ ایم اے کو بھی دیگر مرد ممبران کے ساتھ لڑکیوں کا نصاب تعلیم مرتب کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ساتھ ہی مسلم لڑکیوں کی تعلیمی پستی کو محسوس کرتے ہوئے سرکاری اور بورڈ اسکولوں کے اسٹاف میں پچاس فیصد مسلم اسٹاف کی تقرری، مسلم اکثریتی اضلاع میں مسلم پرنسپل کا تقرر اور تمام سرکاری اسکولوں میں اردو کو ایک لازمی مضمون کے طور پر شامل کئے جانے کا مطالبہ خواجہ گل محمد ایڈووکیٹ فیروز پور نے کیا جس کی تائید پرنسپل مشتاق احمد زاہدی، بھاول پور نے کی۔

میرٹھ کے فیضِ عام انٹر کالج کے وسیع میدان میں 31/ مارچ 1934ء کو جسٹس سر عبدالقادر کی صدارت میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ منعقد ہوا۔ استقبالیہ کمیٹی کا صدر نواب اسمٰعیل خاں کو بنایا گیا جو بعد میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ استقبالیہ کمیٹی کا نائب صدر بھیا شیخ بشیر الدین اور سکریٹری خان بہادر محمد اسلم سیفی کو بنایا گیا۔ جس طرح شیخ عبداللہ کو پاپا میاں اور ان کی بیگم وحید جہاں کو اعلیٰ بی کہا جاتا تھا بالکل اسی طرح اسلم سیفی صاحب کو ابا جی اور ان کی بیگم کو اماں جی کہا جاتا تھا۔ اسلم سیفی کے والد اسمٰعیل میرٹھی نے شمالی ہندوستان میں لڑکیوں کا سب سے پہلا ادارہ قائم کیا جو آج اسمٰعیل گرلس انٹر کالج اور ڈگری کالج کی شکل میں موجود ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی کا سرسید سے گہرا تعلق تھا اور انہوں نے ایم اے او کالج کا نصاب ترتیب دینے میں کلیدی رول ادا کیا تھا۔ میرٹھ کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ مسلم خواتین کی بیداری میں اس شہر نے قائدانہ رول ادا کیا ہے اور شاگردِ غالب حکیم محمد فصیح الدین رنجؔ میرٹھی نے ہی اردو شاعرات کا پہلا تذکرہ تصنیف کیا تھا اور اسے مسلم عورتوں میں تعلیمی بیداری کا پہلا منشور قرار دیا جانا چاہئے۔(6)

یہ بھی محض اتفاق ہے کہ مولانا اسمٰعیل میرٹھی کے صاحبزادے اور مسلم یونیورسٹی کے سابق پرو چانسلر الحاج عبید الرحمٰن خاں شروانی اور یو پی کے سابق گورنر جناب اکبر علی خاں کے ہم جماعت محمد اسلم سیفی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ویمنس کالج کے قیام کی پہلی قرارداد بھی اسی اجلاس میں پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''اس کانفرنس کی رائے میں یہ اشد ضروری ہے کہ مسلمان لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کی غرض سے علی گڑھ میں ایک کالج قائم کیا جائے اور زیادہ مناسب ہے کہ موجودہ انٹرمیڈیٹ گرلس کالج میں بی اے کی ڈگری کا انتظام کیا جائے اور اس تجویز کو عمل میں لانے کے لئے چونکہ سرمایہ کی ضرورت ہوگی اس لئے یہ کانفرنس قوم سے چندہ کی اپیل کرتی ہے۔''

اس جلسہ میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر راس مسعود، نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی، بابائے اردو مولوی عبدالحق، خان بہادر مولوی بشیر الدین ایڈیٹر البشیر (اٹاوہ) حافظ ہدایت حسین بیرسٹر ایٹ لأ، مولانا حافظ احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، حفیظ جالندھری، عبدالعزیز ایڈووکیٹ الہ آباد کے نام خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سر سلطان محمد شاہ آغا خاں کی صدارت میں 21رفروری 1936ء کو کانفرنس کا تین روزہ اجلاس رامپور میں سر محمد رضا علی خاں نواب رامپور کی دعوت پر منعقد ہوا، شعبۂ نسواں کے اجلاس کی صدارت نواب زادہ لیاقت علی خاں بار ایٹ لأ جو تقسیمِ ملک کے بعد پاکستان کے وزیرِ اعظم مقرر ہوئے انہوں نے فرمائی۔

تعلیم نسواں کے اس اجلاس میں پروفیسر عبدالمجید قریشی نے اپنے مقالے میں کہا کہ ''اب ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہیں ہے کہ لڑکیوں کو تعلیم دی جائے یا نہیں بلکہ یہ سوال ہے کہ کس طرح کی تعلیم دی جائے''۔ اسی سلسلہ میں فرمایا کہ ''ہماری لڑکیوں کی تعلیم میں ان تمام امور کو ملحوظ رکھا جانا چاہئے جو ہماری نسلی، تمدنی اور اخلاقی روایات کی حامل ہوں ایک اچھی مسلمان لڑکی یا ایک

اچھی ہندو لڑکی یا ایک اچھی کسی ہندوستانی قوم کی لڑکی ان لڑکیوں سے کہیں زیادہ مفید اور بہتر ہے کہ جو نہ ہندو ہو نہ مسلمان نہ کسی اور مذہب یا ملت کی نام لیوا۔ ہندوستان کے معنی آخر یہ کیوں سمجھ بیٹھ جاتے ہیں کہ نہ ہندو ہو نہ مسلمان نہ کچھ اور"۔

اس شعبہ کے اجلاس نے چار قراردادیں منظور کیں۔

(1) چونکہ آجکل اکثر لڑکیاں جو زنانہ مدرسوں اور کالجوں میں تعلیم پا رہی ہیں وہ اسلامی معاشرت اور تمدن سے ایک گونہ بے تعلق ہوتی جا رہی ہیں اور اس وجہ سے لوگوں کا زنانہ تعلیم کی طرف سے تعصب کم نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ "لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک ایسا نصاب مرتب کیا جائے جو اسلامی تہذیب و تمدن اور روایات کا حامل ہو"۔

(2) دوسری قرارداد میں کہا گیا ہے کہ چونکہ مسلمان استانیاں بہت کم دستیاب ہوتی ہیں اس لئے یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ "جو غریب لڑکیاں ہائی اسکول کے درجوں تک پہنچ جائیں ان کو کالج کی تعلیم یا ٹریننگ کالجوں میں تعلیم پانے کے لئے وظائف اس شرط پر دیئے جائیں کہ تکمیل تعلیم پر ان کو مدارس نسواں میں ملازمت ضرور کرنا پڑے گی"۔

(3) تیسری قرارداد میں کہا گیا ہے کہ یہ جلسہ مسلمانانِ ہند میں تعلیمِ اناث کی کمی اور اس کی شدید ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے تجویز کرتا ہے کہ تحریک نسواں کو کامیاب بنانے کے لئے پروپیگنڈہ کی مناسب تدابیر اختیار کی جائیں اور جو امداد کانفرنس کی جانب سے قومی مدارس کو دی جاتی ہے اس کا ایک معقول حصہ مدارس نسواں کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔

(4) چوتھی اور آخری قرارداد میں کہا گیا ہے کہ اس جلسہ کی رائے میں اس بات کی اشد ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ مسلم گرلس انٹر کالج علی گڑھ کو ڈگری کالج بنا دیا جائے اور حتی الامکان آئندہ گرمیوں کی تعطیل کے بعد بی اے کلاس کھول دی جائے۔

28 دسمبر 1940ء کو پونا میں منعقد آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اکیاون واں سالانہ اجلاس وزیرِ اعظم بنگال مسٹر اے کے فضل الحق کی صدارت میں منعقد ہوا۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر احمد ابراہیم ہارون جعفر نے خطبۂ صدارت مجلسِ استقبالیہ میں تعلیمِ نسواں کے فقدان کو قوم کی نیک نامی پر بدنما داغ قرار دیتے ہوئے کہا کہ "مرد کو تعلیم دے کر صرف ایک فرد کو تعلیم یافتہ بنایا

جاتا ہے لیکن ایک عورت کو تعلیم دے کر ہم پورے ایک خاندان کو تعلیم یافتہ بناتے ہیں۔''

ہماری قوم کو ایسی تعلیم یافتہ عورتوں کی بھی جو اپنی دوسری بہنوں کی تعلیمی رہنمائی کر سکیں، شدید ضرورت ہے۔ ایک ایسی قوم جس کی عورتیں غیر تعلیم یافتہ ہوں گی وہ کبھی خوش حال نہیں ہو سکتی اور ہمیشہ پسماندہ رہے گی۔ اس کے برعکس دوسری قومیں جنہوں نے تعلیمِ نسواں کی اہمیت کو محسوس کر لیا ہے اور اس کو حاصل کرنے میں مصروف ہیں، فارغ البال نظر آ رہی ہیں۔ ہم کو تعلیمِ نسواں میں پسماندگی کے اسباب کو دور کرنے کے لئے فوراً قدم اٹھانا چاہئے۔ یہ اسباب پسماندگی (1) پردہ (2) تعلیمِ نسواں کے خلاف رائے عامہ (3) مخلوط تعلیم کے خلاف عوام کے جذبات (4) افلاس (5) سند یافتہ اور ٹرینڈ مسلم استانیوں کی کمی ہیں۔ آخر الذکر سبب مسلمانوں میں تعلیمِ نسواں کی ترقی میں سب سے زیادہ حارج ہیں۔ جب تک استانیوں کو مہیا کرنے اور تعلیمِ نسواں کی حمایت میں رائے عامہ پیدا کرنے کی سخت کوشش نہ کی جائے گی، اس میں کچھ کامیابی نہ ہو سکے گی۔

وقت آ گیا ہے کہ ''خود اعتمادی'' اور ''اپنی مدد آپ کرو'' کا سبق اب ہم سیکھیں، ہم کو کوشش کرنی چاہئے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنی خدا داد قوتوں پر بھروسہ کریں اور گورنمنٹ کے انعامات پر کم سے کم نظر رکھیں۔ پرائیویٹ کوشش، فطری صلاحیت، خود اعتمادی، بلند ہمتی، عزت نفس آزادی کی بیّن نشانی ہیں۔ لہٰذا ہم کو زیادہ سے زیادہ تعلیمی انجمنیں اور ان کے ذریعہ تعلیم گاہیں قائم کرنی چاہئیں۔ ہم دکن ایجوکیشن سوسائٹی، پونا کی مثال اپنے سامنے رکھ سکتے ہیں جو شاندار تعلیمی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

ایک سرکاری ادارے کے مقابلے میں ایک پرائیویٹ اسکول یا کالج ہر اعتبار سے بہتر ہوتا ہے۔ (7)

ملک کی آزادی کے ساتھ ساتھ یہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کالونی بھی اپنے کاموں سے بہت حد تک آزاد ہو گئی اور اس کی جڑوں کو دیمک نے چاٹ لیا جب کہ اس درخت کی ایک شاخ انجمن ترقی اردوئے ہند اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے آج بھی سرگرم عمل ہے اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی اس شاخ نے جب سے دلّی کو اپنا صدر مقام بنایا ہے مستقل اردو کتابوں کی اشاعت میں بھی شاندار خدمات انجام دے رہی ہے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک سرگرم اور فعال کارکن شیخ محمد عبداللہ نے اپنی آپ بیتی "مشاہدات و تاثرات" میں اس کانفرنس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "بدقسمتی سے اب اس وقت کانفرنس بالکل مردہ ہوگئی ہے، اس میں زندگی کی کوئی بات باقی نہیں رہی ہے لیکن اس کا گزشتہ زمانہ بہت ہی شاندار رہا ہے۔ نواب محسن الملک مرحوم کی فصاحت و بلاغت نے اس کو چار چاند لگا دئے تھے اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی تدبیر و کوشش کی وجہ سے اس ادارے کو بہت عروج حاصل ہوا۔ صاحبزادہ صاحب مرحوم نے علیاً حضرت نواب سلطان جہاں بیگم سے ایک بڑا عطیہ حاصل کر کے ایک بڑی لاگت سے کانفرنس کا دفتر موسومہ سلطان جہاں منزل تعمیر کرائی جواب تک موجود ہے اور وہیں کانفرنس کا دفتر ہے۔

شیخ صاحب اس مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے منتظمین کے بارے میں رقم طراز ہیں "ان کی حالت اب تو وہی ہے جو خانقاہوں کے مجاوروں کی ہوتی ہے کہ کسی بزرگ کے مزار کے اینٹ پتھر اور سنگِ مرمر کے ڈھیروں کے پاس بیٹھے لوگوں کو یاد دلایا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ کا یہ مزار ہے اور ان کی اولاد میں فلاں فلاں صاحب اثر یا صاحبِ کرامات گزرے ہیں اور یہ کل جگہ انہیں بزرگوں کی یاد دلانے کے لئے قائم ہے۔ مجھ کو نہایت سخت افسوس ہے کہ میں نے اس مفید ادارے کو جو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی انتھک کوششوں سے قائم ہوا تھا اس کو تنزل کی حالت میں اپنی آنکھ سے دیکھا ہے.....کانفرنس اب بھی نام کو زندہ ہے لیکن یہ فقرہ اس پر اچھی طریقہ سے چسپاں ہوتا ہے کہ "زندہ در گور" (8)

اس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جمود اور تعطل کا شکار ہونے کا ذکر خود اس کانفرنس کے جنرل سکریٹری پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی نے 1993ء میں دلّی میں منعقد 57ویں سالانہ اجلاس کی روئیداد میں کیا ہے کہ 1955ء میں اس کانفرنس کا 56واں سالانہ اجلاس مدراس میں منعقد ہوا تھا جس کی صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین نے فرمائی تھی۔ "افسوس ہے کہ اس کے بعد 1993ء تک کانفرنس کا سالانہ اجلاس منعقد نہیں ہوا..... گویا 38 سال سے کانفرنس کا سالانہ اجلاس اور پندرہ سال سے مجلسِ عام کا جلسہ نہیں ہو سکا تھا۔"

کانفرنس کی اس زبوں حالی اور پژمردگی پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر

جناب سید حامد نے 24/اکتوبر 1993ء کو غالب اکیڈمی، نئی دلی میں منعقد اس کانفرنس کے 57ویں سالانہ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جہاں تک تعلق ہے، اس کا مقصد علی گڑھ تحریک کو ملک بھر میں پھیلانا تھا، اس کے پیغام کو گھر گھر پہنچانا تھا۔ اوائل ایام میں اس نے زبردست کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ آگے چل کر اس نے مسلمانوں کے تمام اہم مسائل کا احاطہ کرنا شروع کر دیا۔ کانفرنس نے سیاست سے بھی لو لگائی، اس ہیچ مداں کی نظر میں اس نئی دلچسپی نے اسے اپنے بنیادی مقصد یعنی تعلیم کی اشاعت سے ہٹا دیا۔ 1920ء تک کانفرنس بہر حال سرگرم کار رہی۔ یونیورسٹی کیا بنی کہ اس نے پسپائی اختیار کی، گویا اس کا دیرینہ مقصد پورا ہو گیا۔ یہ پسپائی ارادی تھی یا بے ارادہ، اس کا فیصلہ کرنے میں نہیں کھڑا ہوا ہوں، مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اب کوئی ساٹھ سال سے کانفرنس بے عملی اور ہزیمت کا شکار ہے اور گذشتہ نصف صدی سے تو یہ اس حیثیت کو پہنچ گئی ہے، جیسے انسانی جسم میں اپینڈکس کی ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے کہ ایک پل کی غفلت ایک صدی پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ ایک لمحہ کا ذکر کیا، یہاں تو پوری نصف صدی ضائع کر دی گئی۔ یہاں یہ بات بھی آپ کی توجہ کے قابل ہے کہ آزادی کے بعد ایک عرصہ تک جنوبی ہند کے مسلمان سید والا گہر کی وضع کی ہوئی کانفرنس کی طرف دیکھتے رہے کہ وہ تعلیمی مہم میں ان کی رہنمائی کرے گی۔ کوئی تیس سال ہوئے علی گڑھ اور کانفرنس کی طرف سے مایوس ہو کر انہوں نے اپنی تحریک الگ شروع کر دی۔ کیرالا میں مسلم ایجوکیشن سوسائٹی قائم ہوئی (آپ کو معلوم ہے کہ علی گڑھ کے ابنائے قدیم ہی اس کے محرک تھے) اور پھر کرناٹکا میں الامین سوسائٹی، تامل ناڈو میں ایس آئی ای ٹی نے گراں قدر کام کیا اور آندھرا پردیش خصوصاً حیدرآباد میں تو کارگزار انجمنوں اور اچھے اداروں کی بھیڑ لگ گئی۔ لہٰذا اب یہ سوچنا کہ علی گڑھ تحریک کا احیاء علی گڑھ میں ہوگا خام خیالی ہے۔ اب مرکزِ ثقل جنوب کو منتقل ہو گیا ہے۔ علی گڑھ تحریک اگر کبھی زندہ ہوئی تو وہ زیادہ سے زیادہ شمالی ہندوستان کا احاطہ کر سکے گی۔'' (9)

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری جوائنٹ سکریٹری اور اسلامیہ کالج، اٹاوہ کے سابق پرنسپل جناب امان اللہ خاں شروانی خود تحریر فرماتے ہیں کہ ''اب یہ عظیم ادارہ ایک دفتر کی شکل میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اس دفتر کا کام کچھ مکانوں اور دکانوں کا کرایہ وصول کرنا اور اپنی

تنخواہیں حاصل کرنا ہی رہ گیا ہے۔ صرف نام کے لئے چند مدرسوں کو معمولی گرانٹ اور چند غریب اور نادار طلباً کو مالی امداد دی جاتی ہے۔ 89-1988ء کے بجٹ میں ان مدوں میں پانچ ہزار روپیہ رکھے گئے تھے لیکن خرچ چند سو سے زیادہ نہیں ہو سکے۔" (10)

ہندوستان کی آئین ساز مجلس (پارلیامنٹ) نے بھی اس کانفرنس کے تاریخی کردار کو تسلیم کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایکٹ 1981ء کے تحت یونیورسٹی کی سب سے بااختیار مجلس یونیورسٹی کورٹ میں اس کانفرنس کے پانچ نمائندوں کو رکنیت کا حق دیا ہے اور اب اس کانفرنس کا اصل کام اس قانونی ضرورت کے تحت کورٹ کی رکنیت حاصل کرنا ہی رہ گیا ہے۔

سرسید کے زمانے میں زمین جتنی سنگلاخ تھی اب ایسی صورتِ حال نہیں ہے۔ مسلمانوں میں ادارہ سازی کا رجحان بہت تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔ اب مسلمانوں میں مولوی امداد علی جیسا بھی کوئی عالم نہیں ہے جو کفر کے فتوے لگائے اور نہ ہی اکبرالہ آبادی جیسا شاعر ہے جو علی گڑھ تحریک کو اپنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا ہدف بنائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اب اس بے جان تنظیم میں نئی روح پھونکی جائے تاکہ عصرِ جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے مسلمان ایک مرتبہ پھر ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع ہو سکیں۔

☆☆

حواشی

1۔ الطاف حسین حالیؔ: حیاتِ جاوید۔ صفحہ 203

2۔ پنجاہ سالہ تاریخ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس: صفحہ 4۔ مطبوعہ نظامی پریس، بدایوں۔ 1937ء

3۔ خطباتِ عالیہ: صفحہ 35۔ حصہ اول، مرتبہ: انوار احمد مارہروی، مسلم یونیورسٹی پریس، اے ایم یو علی گڑھ 1935ء

4۔ شیخ عبداللہ: مشاہدات وتاثرات۔ صفحہ 144 - 143

5۔ امان اللہ خاں شروانی: مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال۔ صفحہ 76۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ

6۔ ڈاکٹر راحت ابرار: رنج میرٹھی: ۔صفحہ 138، ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

7۔ خطبۂ صدارت: مطبوعہ اجمل پریس، بمبئی 3۔ صفحہ 12

8۔ شیخ عبداللہ: مشاہدات وتاثرات

9۔ روئیداد 57 واں سالانہ اجلاس: مرتبہ: پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی۔ صفحہ 4

10۔ امان اللہ خاں شروانی: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال۔ صفحہ 190، دفتر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سلطان جہاں منزل، علی گڑھ

☆☆

باب سوئم

تعلیم نسواں کے فروغ میں شیخ محمد عبداللہ کی خدمات

شیخ محمد عبداللہ کا شمار جدید ہندوستان کی ان مایہ ناز شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے نہ صرف محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ بلکہ ہندوستان میں تعلیم نسواں کے فروغ کی تاریخ پر اپنی چھاپ ثبت کی ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین نے مصر کے کمانڈر انچیف جنرل نجیب سے شیخ صاحب کا تعارف یہ کہتے ہوئے کرایا تھا کہ "Sheikh Saheb is the founder of women's movement in our country" (شیخ صاحب ہمارے ملک میں عورتوں کی تحریک کے بانی ہیں) (1)

شیخ محمد عبداللہ (1965 - 1874ء) ہندوستان میں جدید فکر کے بانی سر سید احمد خاں (1898 - 1817ء) کے محبوب شاگردوں میں سے تھے اور ان کا شمار محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی پہلی نسل کے طالب علموں میں ہوتا ہے لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ مسلم عورتوں میں جدید تعلیم کا فروغ ہے۔ جس طرح سر سید نے لڑکوں کی تعلیم کے لئے ہر طرح کے مصائب اور مخالفت کا سامنا کیا اسی طرح کی مخالفت شیخ صاحب کو بھی برداشت کرنی پڑی یہاں تک کہ ان کو زدوکوب بھی کیا گیا۔

شیخ محمد عبداللہ 21/جون 1874ء کو کشمیر کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے جد امجد پنڈت سورج رام نے ایودھیا کو خیرباد کہہ کر کشمیر کے دور دراز گوشہ میں پناہ لی جہاں ان کی اولاد سری نگر کے محلہ رینہ واری میں چار پشتوں تک مقیم رہی۔ نکا رام ان کی پانچویں پشت

میں تھا جس نے رینہ واری سے نقلِ مکانی کر کے تحصیل کھوٹہ ضلع راولپنڈی کے موضع نرل میں آ کر اقامت اختیار کی۔ نکا رام کا ایک فرزند بھوج دیو تھا۔ مہتہ کا لفظ جو دراصل ایک معزز خطاب ہے اس خاندان میں سب سے پہلے اسی کے نام کے ساتھ لکھنا شروع ہوا، بھوج دیو نرل سے کوہستان پونچھ میں چلے آئے اور اپنے نام پر یہاں انہوں نے موضع بھوج تھان آباد کیا جو بگڑ کر بھان تھان بنا اور اب ایک عرصہ سے بھان تنی کے نام سے مشہور ہے اور اس وقت تک ان کی اولاد کے قبضہ میں ہے۔ (2)

مہتہ بھوج دیو کی چوتھی پشت میں مہتہ چند ایک عارف اور خدا پرست بزرگ تھے، جن کو اس خاندان کے لوگ صاحبِ کرامات بیان کرتے ہیں۔ مہتہ چند کا ایک بھائی متھرا تھا۔ اس کی اولاد خوب پھلی پھولی۔ متھرا کی تیسری پشت میں چار بھائی تھے جن میں متھا رام اور کیسر رام صاحبِ اولاد ہوئے ہیں۔ متھا رام کے دو صاحبزادے دل باغ رائے اور غریبو تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے کیسر رام کے پوتے مہتہ مست رام کے ہمراہ شمس و راجولی خاں کی شورش کے ایام میں مہاراجہ گلاب سنگھ کو بڑی مدد دی اور ان لوگوں کی مدد سے ڈوگرہ خاندان کو پونچھ کا قبضہ ملا۔ مہتہ مست رام کے دو بیٹے تھے۔ موہر سنگھ اور گورمکھ سنگھ۔ موہر سنگھ کا سب سے بڑا بیٹا مہتہ روپ سنگھ کرسی نشین بھی رہا ہے۔

مہتہ گرمکھ سنگھ کے چار بیٹے ٹھاکر داس، سندر داس، منشی ہری سنگھ اور تارا سنگھ۔ ان میں سے ٹھاکر داس مسلمان ہو کر شیخ محمد عبداللہ ہو گئے۔ اس خاندان کے ایک فرد مہتہ نریندر سنگھ تلوار جو ان دنوں پونچھ میں رہتے ہیں اور صحافت کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے، وہ خود بتاتے ہیں کہ ان کے بزرگوں میں سے تین بھائی گھیانا، مانا اور دیوا نے ایودھیا سے نقلِ مکانی کر کے کشمیر کی وادیوں میں پناہ لی۔ ان تینوں بھائیوں نے ایک ہی وقت میں ایک خواب دیکھا کہ ایک پتھر جو تمہارے قریب پڑا ہے اس کو اٹھا لو اور جہاں تک اس کو لے جا سکو لے جاؤ اور جب پتھر کا بوجھ زیادہ ہو جائے اور تم لوگوں سے اٹھ نہ سکے وہیں پر جا کر بس جاؤ۔ پونچھ کے قریب ایک ویران پہاڑی میں اپنے خواب کی ہدایت و تعبیر کے مطابق انہوں نے رہائش اختیار کر لی اور اس پتھر کو ایک دیوتا کے طور پر پوجنے لگے۔ تین بھائیوں کے نام سے یہ علاقہ بھان تنی (تین بھائی) کہلانے لگا جو اب پاکستان

کے مقبوضہ کشمیر کا حصہ ہے اور آج بھی اس خاندان کو دیوا کے نام پر دیویال کہا جاتا ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ مہتہ مست رام نے شورش کے زمانے میں سکھ مذہب اختیار کرلیا اور پونچھ میں گردوارہ نگالی صاحب کے گدّی نشین ہوگئے۔ مہتہ مست رام کے دو بیٹے موہر سنگھ اور گورمکھ سنگھ تھے۔ گرمکھ سنگھ کے پانچ بیٹے ہوئے، مہتہ ٹھاکر داس، سندر داس، منشی ہری سنگھ، مہتہ تارا سنگھ اور مہتہ لکشمن سنگھ۔ ان میں ٹھاکر داس مسلمان ہوکر شیخ محمد عبداللہ ہوگئے جب کہ ہری سنگھ کے بیٹے پروفیسر وکیل سنگھ جموں یونیورسٹی کے مولانا ابوالکلام آزاد کالج میں فزکس کے پروفیسر سے ریٹائر ہوگئے ہیں۔ ہربنس سنگھ کے بیٹے صحافی مہتہ نریندر سنگھ تلوار پہلی مرتبہ اپنے چچا اور بہنوئی کو لے کر فروری 2007ء میں علی گڑھ آئے اور شیخ عبداللہ خاندان سے پہلی مرتبہ ملاقات کی۔

محمد الدین فوق نے ''تاریخ اقوام پونچھ'' (کشمیر) میں شیخ محمد عبداللہ اور ان کے خاندان کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے اور انہیں سارسوت برہمن خاندان سے متعلق قرار دیا ہے۔

ٹھاکر داس کو بچپن سے ہی تعلیم کا بہت شوق تھا۔ سب سے پہلے استاد قاضی قطب الدین کاشمیری تھے۔ بعد میں پونچھ کے میاں نظام الدین کے مکتب میں داخل کیے گئے اور وہ اپنے گاؤں کی پہاڑیوں کے راستوں سے گذر کر روزانہ پانچ کلومیٹر کا سفر پیدل طے کرکے پونچھ آتے تھے۔ انہیں ایام میں ایک بنگالی بابو سے انگریزی اور ایک پنڈت جی سے تھوڑی سی سنسکرت سیکھی۔

اس زمانے میں جب ٹھاکر داس نے میاں نظام الدین کے مکتب میں داخلہ لیا تھا، پنجاب کے ایک حکیم حاذق مولوی نورالدین، مہاراجہ رنبیر سنگھ کے طبیب خاص مقرر ہوئے۔ حکیم صاحب جموں میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ مہاراجہ موتی سنگھ کے بیٹے ٹکہ بلدیو سنگھ بہت بیمار ہوئے۔ حکیم صاحب کو جموں سے پونچھ بلوایا گیا۔ اس کے بعد وہ اکثر پونچھ آنے لگے۔ راجہ موتی سنگھ نے انہیں اپنے اور اپنے گھر والوں کے علاج کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔ حکیم نورالدین کے میاں نظام الدین وزیر اعظم سے بھی گہرے تعلقات ہوگئے تھے۔ حکیم صاحب پونچھ میں وزیر اعظم کے ہی مہمان رہتے تھے اور پونچھ میں اپنے قیام کے زمانے میں کبھی کبھی مکتب بھی آجاتے تھے اور یہیں ان کی ملاقات اس مکتب کے طالب علم ٹھاکر داس سے ہوئی اور اس پہلی ملاقات میں ٹھاکر داس حکیم صاحب کے قائل ہوگئے اور حکیم صاحب اس لڑکے کی ذہانت اور سوجھ بوجھ کو مان گئے،

مگر کسے معلوم تھا کہ دونوں ایک دن استادی اور شاگردی کے رشتہ میں منسلک ہو جائیں گے اور اس تعلق کی بنائ پر ٹھاکر داس کی زندگی میں ایک زبردست انقلاب آجائے گا۔(3)

حکیم مولوی نورالدین طبیب حاذق ہونے کے علاوہ ایک جید عالم بھی تھے۔ علوم فقہ، حدیث اور تفسیر میں اعلیٰ درجے کی قابلیت رکھتے تھے اور فلسفہ اور طبعی علوم کے سلسلہ میں ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ جب غلام احمد قادیانی نے اپنی تحریک شروع کی تو ان سے جا کر بیعت کرلی اور اپنے پیر و مرشد کے بعد ان کے جانشین بنے۔ وہ اپنے ساتھ ٹھاکر داس کو طب کی تعلیم دینے کے واسطے جموں لے آئے۔ جموں میں مولوی نورالدین کے یہاں ان کے شاگرد مولوی عبدالکریم سیالکوٹی بھی مقیم تھے جنہیں اپنی مادری زبان کے علاوہ دو تین دوسری زبانوں میں کمال حاصل تھا۔ موصوف نے دو تین مہینے میں ٹھاکر داس کو اتنی انگریزی پڑھا دی کہ انہیں پانچویں جماعت میں ترقی دے دی گئی۔ ان کی ذہانت اور ذکاوت سے اسکول کے ماسٹر اندر نرائن اور ماسٹر مکند لال دونوں بہت متاثر تھے اور انہوں نے بھی اسکول کے اوقات کے علاوہ ٹھاکر داس کو انگریزی پڑھانا شروع کردی اور انہیں سالانہ امتحان میں اتنی شاندار کامیابی حاصل ہوئی کہ چھٹی جماعت کے بجائے ساتویں جماعت میں ترقی دے دی گئی۔ تعلیم کے دوران انہیں حکومت کی طرف سے وظیفہ بھی ملنے لگا تھا اور ریاست جموں و کشمیر نے انہیں اپنے خرچ پر لاہور میں بی اے تک کی تعلیم کے لئے مالی امداد فراہم کرنے کا اعلان کیا اور 1887ء میں وہ لاہور چلے آئے اور لاہور کے گورنمنٹ ہائی اسکول (حویلی راجہ دھیان سنگھ) میں داخل ہو گئے۔

ٹھاکر داس نے چار سال تک لاہور میں رہ کر میٹرک کا امتحان دیا اور امتحان دے کر وہ اپنے گھر پونچھ چلے گئے جہاں ان کے گھر والوں نے منگنی کردی اور شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ انہوں نے شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ ان کا ذہن و دماغ زندگی کے اہم مسائل کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھا۔ وہ کسی طرح بہانہ بنا کر لاہور چلے آئے۔ 1889ء میں جب وہ لاہور میں ہی تھے کہ ان کے روحانی استاد حکیم مولوی نورالدین لاہور آئے اور انہیں اپنے ہمراہ لدھیانہ لے گئے جہاں غلام احمد قادیانی نے اپنے ماننے والوں کو بلایا تھا کہ وہ ان کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ 1890ء کو ٹھاکر داس مولوی صاحب کے ہمراہ ایک مرتبہ پھر غلام احمد

قادیانی سے ملنے گئے اور ان کا مذہب اختیار کرلیا اور عبداللہ نام رکھا اور انہوں نے اپنے مسلم دوستوں کے ساتھ ایک ہی میز پر کھانا شروع کردیا اور نماز بھی پڑھنا شروع کردی۔ گویا آپ عملی طور پر مسلمان ہو چکے تھے لیکن عوام کو ان کے اس مذہبی انقلاب کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔

علی گڑھ میں اپنی طالب علمی کے ایام میں اپنے ہم جماعت مولانا ظفر علی خاں (ایڈیٹر اخبار زمیندار) سے جو جماعتِ احمدیہ کے کٹر مخالف تھے، مذہبی چھیڑ چھاڑ رہتی تھی (4) دو سال کے بعد ایم اے او کالج میں موسمِ گرما کی تعطیلات میں وہ قادیان گئے اور مرزا غلام احمد قادیانی سے اپنا مذہبی رشتہ منقطع کرلیا۔ اس طرح اپنے سرپرست کی گرفت سے آزادی کا اعلان کردیا (5)

محسن عبداللہ نے اپنے والد کے چھوٹے بھائی تارا سنگھ کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس خاندان کے ایک فرد ٹھاکر داس نے جب اسلام مذہب اختیار کرلیا تو پونچھ کے مدرسہ کو جہاں شیخ عبداللہ پڑھتے تھے، بطور احتجاج بند کردیا اور اس گاؤں کے لوگوں نے بیس سال تک کسی بھی لڑکے کو تعلیم نہیں دلائی۔

محسن عبداللہ اپنی ددھیال سے متعلق مزید معلومات فراہم کراتے ہیں۔ شیخ صاحب کے اسلام مذہب اختیار کرنے کے بعد ان کا اپنے خاندان سے رشتہ پوری طرح منقطع ہوگیا تھا۔ ان کی شریکِ حیات وحید جہاں بیگم اور صاحبزادیوں کی خواہش رہتی تھی کہ موسمِ گرما کی تعطیلات میں وہ کشمیر جا کر اپنے بزرگوں سے ملیں مگر شیخ صاحب نے زندگی بھر اس کو پسند نہیں کیا۔ ایک مرتبہ محسن عبداللہ نے جموں کے کٹھوا گاؤں جا کر اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کی جنہوں نے سکھ مذہب اختیار کرلیا تھا۔ اس خاندان کے ایک فرد موہن سنگھ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی اور پاپا میاں سے ملنے اکثر عبداللہ لاج بھی آتے رہتے تھے۔

اسی زمانے کے ایک طالب علم مسعود چودھری صاحب جو اس وقت بابا غلام بادشاہ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی یونیورسٹی کے بانی وائس چانسلر ہیں، خود انہوں نے راقم کو بتایا کہ موہن سنگھ کے ہمراہ وہ بھی عبداللہ لاج جایا کرتے تھے اور ممتاز آپا خوب خاطر و مدارات کیا کرتی تھیں۔

شیخ صاحب نے سیرت نبویؐ پر ایک کتاب خاتم الانبیاءؑ کے عنوان سے 1953ء میں شائع کی جو ان کے مذہبی افکار و نظریات کی آئینہ دار ہے۔ لیکن اختلاف رائے یا اختلافِ عقائد کی

وجہ سے شیخ محمد عبداللہ مرزا غلام احمد قادیانی یا حکیم نورالدین صاحب کے ذاتی اوصاف کے خلاف نہیں تھے۔ شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ ''مذہبی پہلو کو نظر انداز کر کے ان دونوں بزرگوں کے صرف انسانی پہلو کو اپنے سامنے رکھ کر اگر کوئی ان کی نسبت رائے قائم کرے تو وہ ان کو ہمدردانِ بنی نوعِ انسان کی صفِ اول میں جگہ دینے پر مجبور ہوگا..... کسی مذہبی اختلافات کی وجہ سے ان کے انسانی اوصاف پر مٹی ڈال دینا انصاف اور انسانیت کے قطعاً خلاف ہے..... مجھ پر ابتداً میں مولوی نورالدین مرحوم کی فلسفیانہ باتوں کا بڑا اثر پڑا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اسلام کے اعلیٰ اصولوں نے میرے دل میں گھر کر لیا اور گو طالب علمی کے زمانہ میں اور وہ بھی صرف تین ماہ مرزا صاحب کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن میرے ایمان اور اعتقاد کی پختگی کے لئے یہ تین ماہ بہت مفید ثابت ہوئے۔'' (6) مولوی حکیم نورالدین سے بھی جوان کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے ان سے بھی قطع تعلق کر لیا اور اپنے مستقبل کو سرسید اور علیگڑھ تحریک کے لئے موزوں پایا۔ مولوی صاحب نے مرتے وقت یہ خواہش ظاہر کی کہ شیخ عبداللہ ان سے ملنے آئیں مگر وہ انتقال کے بعد بھی تعزیت کے لئے نہیں گئے کیونکہ انہیں یہ خدشہ تھا کہ مرتے وقت وہ کہیں انہیں قادیانی مذہب کا خلیفہ نہ مقرر کر دیں۔

شیخ عبداللہ کی صاحبزادی خورشید مرزا اس سلسلے میں مزید روشنی ڈالتی ہیں کہ ''مولوی صاحب کے انتقال کے بعد، عبداللہ ان کی بیوہ کو جب تک وہ زندہ رہیں مستقل رقم بھیجتے رہے۔'' وہ لکھتی ہیں کہ ''مولوی نورالدین کی بیوہ بھی محمد عبداللہ کو خطوط لکھتی رہتی تھیں۔ انہوں نے یہ خطوط دیکھے ہیں اور وہ خطوط محبت اور ہمدردی سے لبریز ہیں اور جس طرح ایک ماں اپنے گم شدہ بیٹے کو خط لکھتی ہے اسی طرح کے یہ خطوط ہیں۔'' شیخ عبداللہ بھی ہمیشہ مولوی صاحب کا ذکر بڑے احترام سے کرتے تھے اور عبداللہ لاج کے مین ہال میں ان کی ایک بڑی سی تصویر بھی آویزاں تھی۔ (7)

حکیم نورالدین نے 22/مارچ 1889ء کو حضرت مرزا غلام احمد قادیانی سے پہلی بیعت لی اور بانی جماعت غلام احمد قادیانی کے 26/مئی 1908ء کو لاہور میں انتقال کے بعد 27/مئی 1908ء کو حکیم نورالدین کو احمدیہ جماعت نے پہلا خلیفہ مقرر کیا۔ خلیفۂ اول کے انتقال کے بعد 14/مارچ 1914ء کو بانیٔ جماعت احمدیہ کے بیٹے حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد دوسرے خلیفہ

منتخب ہوئے۔ (8)

شیخ عبداللہ مولوی نورالدین کا سرسید کے نام ایک سفارشی خط لے کر علی گڑھ آئے اور ایم اے او کالج کے سال اوّل میں داخلہ لے کر سرسید کی آغوشِ تربیت میں شامل ہو گئے اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج سے بی اے، ایل ایل بی کی ڈگریاں لینے کے بعد علی گڑھ میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی۔ شیخ محمد عبداللہ سرسید سے اپنی پہلی ملاقات کو ''زیارت'' سے تعبیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''1888ء کی کرسمس کی تعطیلات میں جب کہ میں گورنمنٹ ہائی اسکول لاہور میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا اور میری عمر قریب پندرہ سال کی تھی تب میں نے سرسید کو سب سے پہلے دیکھا تھا۔ اس سال محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ لاہور میں ہوا تھا اور اپنے مخدوم استاد مولانا نورالدین مرحوم کے ہمراہ میں کانفرنس کے جلسے میں گیا تھا۔ میں نے اس سے قبل اس قسم کے جلسے نہیں دیکھے تھے۔ یوں تو لاہور ایک ایسا شہر تھا کہ اس میں آئے دن بڑے بڑے جلسے ہوا کرتے تھے کبھی ہندوؤں کے، کبھی مسلمانوں کے، کبھی آریہ سماجیوں کے اور کبھی عیسائیوں کے، لیکن مذہبی جلسوں میں ہم طالب علموں کو شرکت کا کوئی موقعہ نہیں ملتا تھا... لیکن محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ خاص مسلمانوں کا جلسہ تھا اور سرسید علیہ الرحمۃ کی فصاحت و بلاغت کی تعریف ہمارے استاد کیا کرتے تھے۔ اس لئے میں کوشش کر کے مولانا نورالدین مرحوم کی وساطت سے اس جلسہ میں شریک ہوا۔ میرے جانے کے بعد جلسہ شروع ہوا۔ سرسیدؒ جہاں بیٹھے تھے ان کے تھوڑی دور پر میری کرسی تھی۔ میں نے سرسید کو اس وقت اچھی طرح دیکھا۔''

شیخ صاحب اپنے بچپن کے نقوش کو تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مولوی نذیر احمد دہلوی نے اس جلسہ میں فرمایا کہ آج کل کے زمانے کی تعلیم میں جو خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے حالات اور واقعات سے طالب علموں کو واقفیت ضرور ہو جاتی ہے لیکن ان کے اعلیٰ اخلاق کی تہذیب و تربیت میں کمی رہ جاتی ہے جس تربیت اور تہذیب پر ہمارے مذہب کی بڑی عمارت کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ (9)

15/ مئی 1891ء کو ایم اے او کالج کی فرسٹ ایئر کلاس میں شیخ محمد عبداللہ کا داخلہ ہوا انہوں نے اپنے داخلہ فارم پر اپنے والد کی جگہ مولوی نورالدین کا نام سرپرست کے طور پر درج

کرایا (10) انہیں پکی بارک میں کمرہ ملا۔ اس کمرے کے قرب میں خواجہ غلام الثقلین، خان بہادر ڈاکٹر حبیب اللہ، خان بہادر مولوی نذیر احمد ریٹائرڈ جج کشمیر، مشہور صحافی مولانا ظفر علی خاں رہا کرتے تھے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد ان کے ہم جماعت تھے اور علی گڑھ کالج کی اس پہلی نسل سے تعلق رکھتے تھے جس نے زندگی کے ہر میدان میں ملک گیر شہرت حاصل کی اور ملک وملت کی شاندار خدمات انجام دیں۔ (11)

شیخ عبداللہ نے ایف اے اور بی اے کے چار سال میں انگریزی، فلسفہ اور فارسی کے مضامین لئے اور انہیں مسٹر تھیوڈور ماریسن سے انگریزی، مسٹر تھامس واکر آرنلڈ (استاد علامہ اقبال) سے فلسفہ، بابو جادو چندر چکرورتی سے ریاضی، شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی و مولانا عباس حسین سے عربی فارسی اور پنڈت شیو شنکر تر پاٹھی سے سنسکرت کی تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ وہ رائڈنگ کلب کے اولین ممبروں میں سے تھے۔ سڈنس یونین کلب کے تقریری مقابلوں میں بھی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ ایک مباحثہ میں انہوں نے محرک اول کی حیثیت سے شرکت کی تھی جس کا عنوان تھا ''ہندوستان کے مسلمان بہ نسبت اور ملکوں کے زیادہ ترقی یافتہ ہیں'' 1896ء میں جب وہ قانون کے طالب علم تھے، کیمبرج اسپیکنگ پرائز کے اعزاز سے نوازے گئے۔ (12)

علی گڑھ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے وہ اپنے قانون کے پروفیسر سید کرامت حسین اور حالی کے قریبی رشتہ دار اور اپنے کالج ہاسٹل کے پڑوسی خواجہ غلام الثقلین کے تعلیمِ نسواں کی حمایت میں پیش کردہ نظریات سے متاثر تھے۔ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ اور کالج میگزین میں شائع شدہ غلام الثقلین کے مضامین کی وجہ سے انہیں علی گڑھ طلباء میں ایک دانش مند لیڈر کی حیثیت سے اہم مقام حاصل تھا۔ ان کی نظر میں مسلم قوم کی تہذیبی وثقافتی نشاۃ ثانیہ کے لئے عورتوں کی تعلیم ضروری تھی۔ (13)

شیخ عبداللہ اپنی سوانح حیات ''مشاہدات وتاثرات'' میں اپنی طالب علمی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''یہ تمام زمانہ ان تمام مشاغل کی وجہ سے کچھ ایسا اچھا گذرا ہے کہ اس کی ایک ایک بات دل پر نقش ہے۔'' کالج سے انہیں اتنی انسیت پیدا ہوگئی تھی کہ کسی کو اپنے ماں باپ کے گھر سے بھی اتنی انسیت نہ ہوتی ہوگی۔

1895ء میں بی اے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے ایل ایل بی میں داخلہ لے

لیا اور وکالت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ ایم اے او کالج میں لائبریرین کے فرائض انجام دیتے تھے اور کالج کے پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک کے سکریٹری بھی ہو گئے تھے اور اس طرح انہیں اس ادارے کے بانی سر سید احمد خاں اور پرنسپل مسٹر بیک کا مکمل اعتماد حاصل ہو گیا تھا۔ (14) اس ملازمت کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اپنے گھر کی فرسودہ رسم و رواج کے خلاف بغاوت کی تھی اور اپنے گھر سے کسی طرح کا تعلق نہیں رکھا تھا اس لئے تعلیم کو جاری رکھنے کے لئے رقم کی ضرورت رہی ہو گی اور خاص طور پر ان کے دور میں نواب زادے، رئیس زادے بڑی تعداد میں اس کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔ ایسے غربت کے حالات نے بھی ان کو نوکری کرنے پر مجبور کیا ہو گا۔

وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے محسن سر سید احمد خاں کی ہدایت پر 1899ء میں علی گڑھ میں وکالت شروع کر دی اور اس پیشہ میں خوب شہرت حاصل کی اور اب ان کا شمار علیگڑھ شہر کے معززین میں ہونے لگا۔ وہ چھ برس تک علی گڑھ میونسپل بورڈ کے رکن بھی رہے اور علی گڑھ بار ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے۔ علیگڑھ بار ایسوسی ایشن کے دفتر میں آج بھی شیخ صاحب کا فوٹو لگا ہوا ہے۔ وہ اتر پردیش کی قانون ساز مجلس (اسمبلی) کے رکن بھی رہے مگر علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی کا درجہ دلانا اور لڑکیوں کے لئے اسکول قائم کرنا ہی ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔

شیخ محمد عبداللہ کی شادی ان کے قریبی دوست بشیر مرزا کی چھوٹی بہن وحید جہاں بنت مرزا محمد ابراہیم بیگ سے 2 رفروری 1902ء کو ہوئی۔ مرزا ابراہیم بیگ کے آبا و اجداد مغل تھے جنہوں نے برطانوی حکمرانی کے عبوری دور میں تعلیم اور سرکاری ملازمت کی روایات کو قائم رکھا تھا۔ مرزا ابراہیم بیگ دلی کے ادنیٰ درجہ کے میونسپل آفیسر تھے۔ وہ سر سید احمد خاں کی تعلیمی تحریک کے حامی تھے۔ انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے بشیر مرزا کو علی گڑھ بھیجا جہاں وہ شیخ عبداللہ کے ہم سبق تھے (15) مرزا بیگ نے اپنی لڑکیوں کو اردو اور فارسی کے علاوہ یوروپین خواتین کے ذریعہ گھر پر انگریزی کی تعلیم بھی دلائی تھی۔ اس شادی کے موقعہ پر ان کے بزرگوں اور دوستوں نے جس شفقت اور یگانگت کا برتاؤ کیا اس کا ذکر کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

''انہوں نے مجھے اس بات کا خیال بھی نہ آنے دیا کہ اس وقت میرا کوئی رشتہ دار یا بھائی میرے پاس نہیں ہے۔ اس شادی میں جتنے احباب شریک ہوئے ان میں سے ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ

تقریب ہمارے کسی بھائی یا عزیز کی ہے۔ میرے دل پر اب تک اس تقریب کا نقشہ موجود ہے اور اس بات کا احساس ہے کہ اسلامی اخوت و محبت خون کے رشتے سے کچھ کم نہیں ہوتی..... برات میں جو لوگ شریک ہوئے اس میں علی گڑھ تحریک کی اہم شخصیتیں شامل تھیں ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔نواب محسن الملک ، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ،نواب سر سلطان احمد خاں ، خان بہادر سید زین العابدین ، نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں ، سید زین الدین خاں بہادر ، سید عبداللہ شاہ سابق پولیٹیکل منسٹر مالیر کوٹلہ ، شمس العلمائ مولوی ذکاءاللہ ، مسٹر اسمٰعیل خاں بیرسٹرایٹ لا ، میر محمود حسن ، میر فیض الحسن ، حاذق الملک حکیم اجمل خاں ، حکیم سید احمد خاں ، پنجاب کے خان بہادر مولوی نذیر احمد اور مولوی شہاب الدین وکیل علی گڑھ اور رئیس خواجہ محمد یوسف بھی اپنے دونوں صاحبزادوں خواجہ محمد یحیٰ اور عبدالمجید خواجہ کے ساتھ شادی میں شرکت کے لئے تشریف لائے۔'' (16) شیخ عبداللہ نے اگر چہ اپنے خاندان سے مذہبی تعلق توڑ ڈالا تھا لیکن ان کے کشمیری بیک گراؤنڈ کی ادبی اور سیکولر اقدار ان کے علی گڑھ کے ہم سبق مسلم ساتھیوں کی تہذیب میں مکمل یکسانیت تھی۔

ایک تعلیم یافتہ خاتون سے شادی کرنے کے بعد شیخ صاحب نے مسلم خواتین کی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے ٹھوس اقدام پر غور کرنا شروع کر دیا۔

شادی کے بعد شیخ عبداللہ کچھ عرصہ تک تار والے بنگلے میں رہے اور پھر محلہ رسل گنج میں نواب چھتاری کی ملکیت چھتاری کمپاؤنڈ میں کرایہ پر رہنے لگے۔ شیخ صاحب نے 1905ء میں ہی لالہ لالتا پرساد کایستھ کا نانک رام کا باغ 1950 روپیہ میں خرید لیا اور یہ باغ اتنا بھاگوان نکلا کہ 5100 روپیہ میں اس باغ کی لکڑی فروخت ہوئی۔ 1910ء میں اس باغ کے قریب ہی 9 بیگھ پختہ کا ایک قطعہ اور خرید لیا۔ 1922ء تک وہاں عبداللہ لاج کے نام سے ایک کوٹھی تعمیر کرائی۔ شیخ صاحب کے آٹھ بچے پیدا ہوئے اور وحید جہاں کا انتقال 1939ء میں ہوا جب کہ شیخ صاحب کا انتقال 1965ء میں ہوا۔ ان دونوں کے پختہ مزارات اس کوٹھی کے داہنے طرف ایک چہار دیواری میں محفوظ ہیں اور دونوں پر کتبے بھی لکھے ہوئے ہیں۔ راقم اس کتاب میں ان کے مزارات کی تصویروں کے لئے جب فوٹو لینے پہنچا تو دیکھتا ہے کہ ایک مور اپنے پنکھ پھیلائے

ناچ رہا تھا جب کہ مورنی پاس ہی گھوم رہی تھی۔ مور ہمارے ملک کا قومی پرندہ ہے۔ شیخ عبداللہ کی شخصیت اور کارنامے بھی قومی خدمت سے عبارت ہیں۔

شیخ عبداللہ نے ملک کی نصف آبادی کو جو ہمارے سماج کا سب سے اہم حصہ ہے، جب ظلم و بربریت کا شکار ہوتے دیکھا تو انہیں عورتوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے خود میدان عمل میں کودنا پڑا۔ انہوں نے اپنے گھر میں اپنی ماتا جی کو ظلم و زیادتی کا شکار ہوتے دیکھا تھا۔ ماتا جی کے لئے ہمدردی کے جذبات نے آگے چل کران کے دل میں صنف نازک کے لئے ایک خاص ہمدردی پیدا کردی۔ ان کے والد پولیو کی وجہ سے معذور تھے اور بڑے بھائی کی بیوی گھر پر حکمرانی کرتی تھی اور وہ ان کی ماں کے ساتھ ایک نوکرانی کا سا سلوک کرتی تھی۔ عورتوں کو بے کسی، کسمپرسی اور مظلومیت کی حالت میں دیکھ کران کا جی تلملا اٹھتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ اسکول سے اپنے گاؤں بھان تنی واپس ہو رہے تھے کہ دشوار گذار پہاڑی راستوں پر انہیں ایک ڈوگرہ سپاہی ملا اس کے ساتھ ایک مسلمان عورت بھی تھی جس کے سر پر ایک من کا بوجھ لدا ہوا تھا۔ بے چاری عورت حاملہ تھی اور اس کے لئے بغیر بوجھ کے چلنا بھی دشوار تھا۔ سپاہی اس سے نہایت بدتمیزی سے پیش آرہا تھا۔ عورتوں کے ساتھ ہندوستانی سماج کا جو سلوک تھا اس سے انہیں بہت نفرت تھی۔ عورتوں پر رسم و رواج کے پردہ میں جو مظالم ڈھائے جاتے تھے وہ انہیں بالکل پسند نہ تھے۔

لاہور میں اپنی طالب علمی کے قیام کے دوران بھی انہوں نے عورتوں پر مظالم ہوتے دیکھے تھے۔ لاہور کے بورڈنگ ہاؤس کے قریب ہی کسی پرانے نواب کا مکان تھا جن کی چار بیویاں تھیں۔ وہ سر شام ہی سے اپنے گھر میں اپنی بیویوں میں سے ہر ایک کو باری باری رات دیر تک زدوکوب کرتے رہتے تھے۔ یہ واقعات آئے دن پیش آتے رہتے تھے۔ اس لئے شیخ صاحب اور ان کے دیگر ساتھی چاروں بیویوں کی آواز پہچان گئے تھے۔

1920ء میں جب تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وجود عمل میں نہیں آیا تھا اس وقت تک ایم اے او کالج کے طلباً پہلے کلکتہ اور پھر الہ آباد امتحان دینے جاتے تھے۔ 1895ء میں شیخ صاحب بھی بی اے کا امتحان دینے الہ آباد گئے تھے جہاں انہوں نے ایک اور تکلیف دہ واقعہ دیکھا۔ ایک بازار میں بہت سے مرد اور عورتیں جمع تھیں۔ شیخ صاحب قریب گئے تو پتہ چلا کہ ایک نالائق مرد

ایک نوجوان لڑکی کو سرِ عام کانٹے دار لکڑی سے مار رہا ہے اور اس لڑکی کے بدن سے خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ کچھ لوگ دور سے ہی یہ کہتے تھے کہ ''مت مارو'' لیکن چھڑانے کے لئے کوئی آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ شیخ صاحب اس تماشہ کا حصہ بننے کے بجائے اس مرد سے لڑنے لگے اور عورت کو پیٹنے پر اس کے خلاف قانونی کارروائی کی دھمکی بھی دی۔

شیخ صاحب نے ''سوانح عمری عبداللہ بیگم'' میں ایک اور دل دہلانے والے واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''اتر پردیش کے کسی شہر میں ایک بڑے میاں کی دو لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے اب تک ان کی شادی نہیں کی تھی۔ وہ اپنے کو صحیح النسب سید سمجھتے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ دو نجیب الطرفین سید لڑکے مل جائیں تو اپنی لڑکیوں کی شادی کر دیں۔ خدا خدا کر کے ایک ایسے لڑکے کا پیغام آیا جس کو وہ سید مانتے تھے۔ انہوں نے فوراً اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دی۔ جس خاندان میں شادی ہوئی اس کے افراد بڑے میاں سے بھی زیادہ جاہل تھے۔ غریب سیدانی وہاں پہنچ کر مصیبت میں مبتلا ہوگئی۔ اس کو یہ بھی اجازت نہ تھی کہ وہ اپنے ماں باپ یا کسی قریبی رشتہ دار کے گھر جائے۔ ایک مرتبہ اسے پتہ چلا کہ اس کی سگی خالہ بسترِ مرگ پر پڑی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہیں۔ شوہر اس وقت گھر پر نہ تھا۔ لڑکی بغیر شوہر کی اجازت کے ڈولی میں بیٹھ کر اپنی خالہ کے گھر چلی گئی اور کچھ دیر بعد ہی خالہ کا انتقال ہوگیا۔ جب گھر واپس لوٹی تو اس کا شوہر بیٹھا دانت پیس رہا تھا۔ اس ظالم شوہر نے اس بے چاری لڑکی کو اتنا مارا کہ اس نے سسک سسک کر اپنی جان دے دی۔ لڑکی کے باپ کو جب اپنی لڑکی کی موت کی اطلاع ملی تو وہ اپنے داماد کے گھر پہنچا۔ بہت رویا پیٹا اور خوب شکوے اور شکایتیں کیں مگر کچھ دیر بعد ہی کہنے لگا کہ ''قسمت کی اچھی تھی جو تمہارے ہاتھ سے مرگئی۔'' دونوں نے اس واقعہ کی کسی کو خبر نہ ہونے دی اور لڑکی کی لاش کو سپردِ خاک کر دیا۔

چند روز کے بعد اس جاہل باپ نے اپنی دوسری لڑکی کا اپنی بڑی لڑکی کے قاتل شوہر سے نکاح کر دیا۔ شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ اس قسم کے بہت سے واقعات ان کے علم میں آئے اور اس سے انہیں تعلیم نسواں سے ہمدردی پیدا ہوگئی اور یہ سوچنے لگے کہ تعلیم سے ہی ان مظالم کو روکا جاسکتا ہے اور اگر لڑکیاں تعلیم یافتہ ہوگئیں تو وہ اپنا دفاع خود کرنے لگیں گی۔'' (17)

جب وہ ایل ایل بی کے طالب علم تھے اس وقت انہوں نے ترک عورتوں کی تعلیم پر ایک مضمون علی گڑھ میگزین کے لئے لکھا تھا۔ ان سب واقعات، حالات اور حادثات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ شیخ صاحب کو اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی تعلیمِ نسواں سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور ان کا یہ جذبہ آہستہ آہستہ پروان چڑھتا گیا اور تمام طرح کی مخالفتوں اور مشکلات کے باوجود ایک مردِ مجاہد کی طرح بے خطر اس میدان میں کود پڑے۔ علی گڑھ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے شیخ عبداللہ اس نظریہ کے سیلِ رواں کا ایک حصہ تھے جس کا رخ انیسویں صدی کے آخر میں مسلم خواتین کی تعلیم کی حمایت کی جانب مائل ہو رہا تھا۔ سرسید نے آخر تک یہی کہا کہ عورتوں کی تعلیم قبل از وقت ہے۔ لیکن دیگر مصلحین کا خیال اس کے برخلاف تھا۔ 1884ء میں علیگڑھ اسٹوڈینٹس یونین کے ایک مباحثہ میں تعلیمِ نسواں کی تجویز کثرتِ رائے سے ناکام ہوگئی لیکن جلد ہی اس رائے میں تبدیلی پیدا ہوگئی۔ کیونکہ علی گڑھ کے طلباً کو تعلیم یافتہ بیویاں حاصل کرنے کی فکر لاحق ہوگئی۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ لوگوں میں 1890ء کی دھائی میں مسلم خواتین کی تعلیم کی حمایت میں اور پردہ کی پابندی کے خلاف جنہوں نے مضامین شائع کئے وہ غلام الثقلین اور سید سجاد حیدر یلدرم تھے۔ یہ دونوں یونین کے مباحثہ میں پیش پیش تھے جب کہ اسلامی نقطۂ نظر کے حامی طلباً مغربی تہذیب کی مخالفت میں تقریریں کر رہے تھے۔ (18)

شیخ عبداللہ کے دور میں عورتوں کے ستی ہونے کے واقعات بھی عام تھے۔ وہ اس ستی کی رسم کو ہندو مذہب پر ایک کلنک تصور کرتے تھے۔

اپنے ایک مضمون "مکالمہ" میں شیخ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "ہمارے علماً خواہ ہندو ہوں یا مسلمان کبھی ادھر توجہ نہیں کرتے کہ خود علوم جدیدہ سے واقفیت حاصل کریں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دور سے بیٹھے بیٹھے برا بھلا ضرور کہتے ہیں۔ مسلمان علماً تو ان کو کبھی منہ نہیں لگاتے اور فرض کر لیتے ہیں کہ یہ مردود ملعون انگریزی خواں اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے مذہبی معاملات میں بات چیت کی جائے لیکن دشواری تو آ کر یہ پڑی ہے کہ اس وقت ہماری قوم میں جو کچھ بھی دکھائی دیتا ہے وہ انہیں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی وجہ سے دکھائی دیتا ہے۔ علم ان کے پاس ہے، ہنر ان کے پاس ہے، تالیف و تراجم انہیں کی بدولت ملک میں پھیلتے ہیں۔ سرکاری دربار میں اور

ملازمت میں جو کچھ بھی مسلمانوں کا حصہ ہے وہ فقط انہیں انگریزی نوجوانوں کی وجہ سے قوم کو حاصل ہے۔ پھر ہم اس بڑی اور ضروری اور روز افزوں ترقی کرنے والی تعداد کی طرف سے غفلت کیسے کر سکتے ہیں؟

وہ علمائے دین کو متوجہ کرتے ہیں کہ ان کا دینی فرض ہے کہ وہ خود جدید علوم اور سائنس سے واقفیت حاصل کریں، ملک میں دہریت پھیلنے کو روکیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''مجھ کو اس بات کے دیکھنے سے سخت رنج ہوتا ہے کہ ہمارے بہت سے نوجوان علوم پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی ہستی سے منکر ہو جاتے ہیں اور اگر ان کے سامنے مذہب کا نام لیا جائے تو اس کو سننا بھی پسند نہیں کرتے بلکہ بیزاری ظاہر کرتے ہیں۔ اس میں نہ علوم جدیدہ کا قصور ہے اور نہ ان کے علوم حاصل کرنے والوں کا قصور ہے۔ اس میں ان لوگوں کا قصور ہے جو علومِ جدیدہ سے جو قباحت پیدا ہو رہی ہے اس کو روکنے کی کوئی تدبیر نہیں کرتے۔

اس قباحت کو روکنے کا صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ ہے کہ جو مذہبی تعلیم کے لئے استاد رکھا جائے اس سے علومِ جدیدہ کی واقفیت قطعی لازمی قرار دی جائے اور ایسے معلم بکثرت تیار کئے جائیں جو تعلیم یافتہ گروہ کی مشکلات کو انہی کے علوم کے دلائل سے حل کرنے کے قابل بن جائیں۔ جب تک مذہبی معلموں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی معلومات اور نصب العین میں تفریق اور بعد باقی رہیں گے اس وقت تک نہ تو ہمارے معلم جدید تعلیم حاصل کرنے والوں کو فائدہ پہنچا سکیں گے اور نہ جدید تعلیم یافتہ لوگ اپنے مذہبی معلموں سے استفادہ حاصل کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔'' (19)

1902ء میں دلی میں منعقد آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں شیخ محمد عبداللہ کو شعبۂ تعلیمِ نسواں کا سکریٹری مقرر کیا گیا تبھی انہوں نے اپنی شریک حیات وحید جہاں بیگم سے جو ان دنوں اپنے مائکے میں مقیم تھیں، کہا کہ اپنی ملنے والی نوعمر پڑھی لکھی لڑکیوں کو جمع کر کے ان سے معلوم کرو کہ تعلیمِ نسواں کے بارے میں ان کے کیا خیالات ہیں اور ان کی رائے میں وہ کون سی تدابیر ہو سکتی ہیں جو اس کام کو مسلمانوں میں مقبول بنانے کے لئے اختیار کرنی چاہئیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے گھر پر محلّہ کی خواندہ عورتوں کا ایک جلسہ منعقد کیا جس میں مولوی ذکاءُ اللہ

دہلوی کے صاحبزادے رضا اللہ کی بیگم اور دوسری بیگم سعید احمد جن کا تعلق سر سید کے خاندان سے تھا وہ بھی شریک ہوئیں۔ حاضرین میں سے بہت سی عورتوں نے تعلیمِ نسواں کی حمایت میں تقریریں کیں۔ یہ تقریریں اور تجاویز اور جلسہ کی کارروائی شیخ صاحب نے بیگم عبداللہ کی مدد سے ایک رسالہ کی شکل میں مرتب کردی اور رسالہ کو چھپوا کر محلّہ میں تقسیم کرایا اور لوگوں میں تعلیمِ نسواں سے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں کہ اب تو فرنگیوں کے طریقے اختیار کرنے کی تجویز ہو رہی ہے۔لڑکیوں کے مدرسے کھلیں گے اور لڑکیاں کھلے منھ مدرسوں میں جایا کریں گی۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ تعلیمِ نسواں کے سکریٹری بننے کے بعد یہ پہلا کام تھا جو شیخ عبداللہ نے انجام دیا۔اس سے انہیں اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ اس کام کو انجام دینے میں ان کی بیگم سب سے زیادہ معاون ثابت ہوسکتی ہیں۔ اب ان کو ایسے مسلم سماج کے لئے جہاں کم سن لڑکیوں کو بھی نامحرم مردوں سے بات تک کرنے کی اجازت نہ تھی، عورتوں میں کام کرنے کا عملی منصوبہ بنانا بہت مشکل نہیں رہا۔ شیخ صاحب چاہتے تھے کہ عورتوں میں خود اعتمادی پیدا ہو اور وہ اپنی تعلیم و ترقی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے خود آگے آئیں اور مرد اس جدو جہد میں ان کی مدد کریں۔اس وقت کے زیادہ تر مسلمان عورتوں کی تعلیم کو اپنی نام نہاد تہذیب اور شرافت کا دشمن تصور کرتے تھے اور وہ ان زنانہ مدارس کو اسلامی روایات کے منافی مانتے تھے۔ایک عام خیال یہ بھی تھا کہ لڑکیوں کے اسکولوں کے قیام کی وجہ سے پردہ ختم ہوجائے گا۔اس بحث میں عورتیں بھی حصہ لے رہی تھیں۔ان کا کہنا تھا کہ ''ہماری شرافت پردے کے سہارے قائم ہے۔ پردہ اٹھ گیا تو ان کی عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔'' جو لوگ تعلیمِ نسواں کے حمایتی تھے ان کے دلوں میں بھی طرح طرح کے شک و شبہات تھے۔ شیخ صاحب نے ایک جگہ ذکر کیا ہے کہ امرتسر کی ایجوکیشنل کانفرنس میں ان کے مشفق استاد علامہ شبلی نعمانی نے اجلاس کی کارروائی کے دوران ہی یہ وضاحت طلب کہ آپ نہایت صفائی کے ساتھ بتادیجئے کہ مدرسہ میں پردہ رہے گا یا نہیں؟ مولانا شبلی تعلیمِ نسواں کی اہمیت سے واقف تھے اور تعلیمِ نسواں کی ضرورت کے قائل تھے لیکن سر سید کی طرح وہ بھی پردے کے زبردست حامی تھے۔ شیخ صاحب نے جواب دیا کہ ''پردہ بطور اسکول ڈسپلن کے لازمی ہوگا''

٧٥

شیخ صاحب نے مسلمانوں میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے صحافت کا بھی سہارا لیا اور 1904ء میں اردو ماہنامہ ''خاتون'' شائع کیا اور اسی سال کانفرنس کے موقعہ پر زنانہ مصنوعات کی نمائش کا اہتمام کیا۔ ان دونوں سرگرمیوں کی وجہ سے وہ ملک بھر کی ایسی خواتین سے واقف ہوگئے جو تعلیمِ نسواں کی حامی تھیں اور ان کی مدد سے عورتوں میں اپنی تحریک کی تبلیغ و اشاعت شروع کردی۔ وہ چاہتے تھے کہ علی گڑھ میں جو ادارہ تعلیمِ نسواں کے لئے قائم ہو اس کو ایسی ہی مرکزیت حاصل ہو جیسی کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو ملک بھر میں حاصل ہوگئی ہے۔

چودھا سال تک اردو ماہنامہ ''خاتون'' نکالنے کے بعد شیخ عبداللہ نے ''راز ترقی'' کے نام سے اردو کا ایک اور ماہنامہ فروری 1946ء میں جاری کیا تھا۔ جولائی 1946ء کے شمارے میں انہوں نے مسلم گرلس کالج و ہائی اسکول کے نتائج شائع کئے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس سال ہائی اسکول کے امتحان میں 36 لڑکیاں شامل ہوئیں جن میں تیس کامیاب ہوئیں۔ ایف اے (آرٹس) میں 30 میں سے 23، ایف اے (سائنس) میں 16 میں سے 14، بی اے (آرٹس) میں 35 میں سے 32، بی اے (سائنس) میں 4 میں سے 4، ایم اے فائنل میں 6 میں سے 5 اور بی ٹی میں 18 میں سے 18 کامیاب ہوئیں..... ایم اے فائنل کی سبھی طالبات شعبۂ جغرافیہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ مشہور افسانہ نگار سلمیٰ رشید صدیقی نے 1946ء میں بی اے آرٹس کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ 1946ء میں بھی لڑکیوں کا رزلٹ لڑکوں سے بہتر تھا۔

ماہنامہ ''راز ترقی'' کے سرورق سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک شیخ عبداللہ مسلم گرلس کالج کے آنریری سکریٹری تھے اور اس کالج کا یونیورسٹی سے الحاق نہیں ہوا تھا۔

شیخ صاحب کی اس تحریر سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ویمنز کالج اور گرلس ہائی اسکول کا تعلیمی سیشن یکم ستمبر سے شروع ہوتا تھا اور بی ایس سی میں مقابلہ جاتی داخلہ امتحان کی بنیاد پر ہی داخلہ دیا جاتا تھا اور شہر کی لڑکیوں کو لانے لے جانے کے لئے لاری کا بھی معقول انتظام ہو چکا تھا۔ (20)

ماہنامہ خاتون کے جنوری 1909ء کے شمارے میں ''زنانہ مدرسہ'' کے عنوان سے بانئ مدرسہ شیخ محمد عبداللہ رقم طراز ہیں کہ ''اس وقت ہمارے مدرسہ میں قریب ایک سولڑکیاں بھرتی ہوگئی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہر طرح سے کام قابلِ اطمینان ہو رہا ہے۔ ہم اس سے پیشتر بھی

اعتراف کر چکے ہیں کہ اس مدرسہ کے قائم کرنے میں زیادہ حصہ ہندوستان کی خواتین کا ہے۔ سب سے اول حضور عالیہ بیگم صاحبہ بھوپال اور ان کے بعد ہماری ہمدرد بہنوں مس زہرہ فیضی صاحبہ ومس عطیہ فیضی صاحبہ، مسز علی اکبر صاحبہ، سلطانہ بیگم صاحبہ وغیرہ معزز خواتین نے اس طرف توجہ کی اور ہز ہائینس بیگم صاحبہ جنجیرہ ودیگر عالی مرتب بیگمات نے اپنا دستِ شفقت اس کے سر پر رکھا اور ان سب کی خاصی ہمدردی کی وجہ سے آج یہ مدرسہ اس درجہ تک پہنچا ہے۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو اس کے ٹوٹنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ ایک دن یہ پودھا ضرور بفضلِ خدا بڑھے گا اور پھل پھول لائے گا اور لوگ اس کو ایک شاندار اور مفید چیز خیال کر کے اس کو ترقی دینے اور شاداب بنانے کے لئے تیار ہو جائیں گے اور اس وقت کی ہمدردی کرنے والوں کو جو اپنی قوم اور ملک سے اپنی فیاضی اور کوشش کے لئے بہت آسانی سے داد حاصل کر سکیں گے.....

آنے والی نسلوں کے لئے ہم بطور ایک ابتدائی یادگار کے یہاں پر یہ ایک نوٹ درج کرتے ہیں کہ ایک بی بی ہیں جو عرصہ سے علیل ہیں۔ ایک ننھی سی بچی ہے جو ان سے ایک لمحہ بھی علیحدہ ہونا نہیں چاہتی اور اس پر اپنے گھر کا انتظام کرنا پڑتا ہے لیکن اس پر بھی وہ اکثر صبح نو بجے سے مدرسہ پہنچتی ہیں۔ استانیوں کے کام کی پوری نگرانی کرتی ہیں اور شام کے پانچ بجے تک برابر مدرسہ میں بیٹھی رہتی ہیں۔ اپنی بچی کی اور اپنے گھر کی اور اپنی صحت کی مطلقاً کچھ پرواہ نہیں کرتیں۔ دن بھر لڑکیوں کی حفاظت میں کہ شریفوں کی بچیاں ہمارے بھروسہ پر بھیج دی گئی ہیں اور مدرسہ بند ہونے کے بعد گھنٹہ آدھ گھنٹہ استانیوں کے آپس کے قصے فیصل کرنے میں صرف کرتی ہیں اور پھر آ کر کہیں دن کا کھانا نصیب ہوتا ہے۔"

ہندوستان میں تعلیمِ نسواں کی پرزور مبلغ بیگم سلطان جہاں والئ ریاست بھوپال نے سو روپیہ ماہانہ کی امداد مستقبل کے زنانہ اسکول کے لئے منظور فرمائی۔ اس خط کے بعد ہی انہوں نے طے کر لیا کہ چاہے کتنی بھی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑے مگر اب یہ اسکول علی گڑھ میں ہی قائم ہوگا۔ ہر چند کہ ان کے دیرینہ رفیق صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جو خود تعلیمِ نسواں کے موافق تھے مگر علی گڑھ میں اسکول کے قیام کے حق میں نہیں تھے۔ اس خط کو لے کر شیخ صاحب لکھنؤ میں منعقد ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں شرکت کے لئے روانہ ہو گئے اور لکھنؤ میں راجہ جہانگیر آباد کی کوٹھی

پر ایم اے او کالج کے سکریٹری نواب محسن الملک سے ملاقات کی اور بیگم بھوپال کا خط ان کو دکھایا جس پر نواب محسن الملک نے اپنے غصہ کے اظہار کی یہ صورت نکالی کہ اپنی ترکی ٹوپی اتار کر صحن میں پھینک دی اور فرمایا کہ پہلے ہی لوگ کالج کے مخالف تھے۔ اب جب سنیں گے کہ علی گڑھ میں لڑکیوں کا مدرسہ بھی جاری ہو رہا ہے تو ان کی مخالفت کی آگ اور بھی مشتعل ہو جائے گی۔ تھوڑی دیر بعد جب ان کے غصہ میں کچھ کمی ہوئی تو شیخ عبداللہ اٹھ کر گئے اور ان کی ٹوپی اٹھا کر ان کے سامنے میز پر رکھ دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ گاڑی میں سوار ہوئے اور شیخ صاحب بھی سامنے بیٹھ گئے اور راستہ میں ان سے کہا کہ اگر آپ اس کی مخالفت کریں گے تو جدید نسل کے لوگ آپ کے بہت مخالف ہو جائیں گے۔ سب لوگ یہی چاہتے ہیں کہ لڑکیوں کو تعلیم دلائی جائے۔ آپ نے پہلے تو کبھی مخالفت نہیں کی لیکن آج آپ نے مخالفت کیوں کی؟ یہ سن کر نواب صاحب مسکرائے اور کہا کہ ''تم اپنا کام کئے جاؤ۔ میں نے اپنا کام کیا ہے۔ تمہارا کام تو نہیں کیا۔ اس کی بہت ضرورت تھی کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ میں کسی مدرسہ کے قائم کئے جانے کا حامی نہیں ہوں۔'' (21) لکھنؤ کے اسی اجلاس میں علی گڑھ میں لڑکیوں کے اسکول کو قائم کرنے کی تجویز منظور کر لی گئی۔

اس کامیابی کے باوجود ابھی شیخ عبداللہ کو فنڈ اکٹھا کرنے اور عوامی رابطہ پیدا کرنے کے معاملے میں بہت کچھ کرنا تھا۔ 1905ء کے وسط میں تعلیمِ نسواں کے حامی ایم اے او کالج کے طلبا کا ایک وفد بمبئی کے دورے پر گیا اور چار ہزار روپیہ سے زائد کی رقم جمع کی۔ یہ چندہ وہاں کے خوشحال مسلمانوں بالخصوص جسٹس بدرالدین طیب جی اور ان کے خاندان والوں سے حاصل ہوا۔ ان کی حمایت کرنے والوں میں سرفہرست زہرہ اور عطیہ فیضی تھیں جنھوں نے عورتوں کی دستکاری کی ایک نمائش اور مسلم خواتین کا جلسہ منعقد کرنے میں بھی شیخ صاحب اور بیگم عبداللہ کی مدد کی۔

دوسرے ہی سال بھوپال سے بھی اسکول کی گرانٹ کے طور پر ایک سال کے 1200 روپیہ موصول ہوگئے۔ اب اسکول کے لئے کوئی جگہ تجویز کا خیال پختہ ہوگیا۔ 1905ء میں ہی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ علی گڑھ میں ہونا قرار پایا اور شیخ صاحب نے اس کانفرنس کے تعلق سے ایک لیڈیز کانفرنس منعقد کرنا طے کر لیا اور ممبئی کی عطیہ فیضی، زہرہ فیضی اور جسٹس بدرالدین طیب جی کی صاحبزادیوں کو علیگڑھ آنے کی دعوت دی۔ اس زمانے میں علی گڑھ میں

عورتوں کا کوئی جلسہ کرنا یا ان کی مصنوعات کی نمائش کرنا بہت دشوار تھا۔ نواب محسن الملک نے پہلے اس جلسہ کی اجازت دے دی اور سائنٹفک سوسائٹی کے دفتر (حال دواخانہ طبیہ کالج) کو مہمانوں کے ٹھہرنے کے لئے الاٹ کر دیا مگر لوگوں کی مخالفت اور عوامی دباؤ کی وجہ سے اس الاٹ منٹ کو منسوخ کر دیا اور عورتوں کے جلسہ پر پابندی عائد کر دی۔

شیخ صاحب صبح اٹھ کر مکان کی تلاش میں نکل پڑے۔ پورے شہر میں کسی بھی مسلمان نے اپنا مکان نہیں دیا بلکہ ان کے ایک پارسی دوست نے شاہ پور جی والی کوٹھی چند روز کے لئے دے دی اور اسی وقت اس کوٹھی پر قبضہ لے لیا اور صفائی ستھرائی کے بعد بمبئی سے آنے والی ان خواتین کو شاہ پور جی کی کوٹھی میں ٹھہرایا گیا۔ نمائش کے لئے چین، برما، بغداد، افغانستان اور کشمیر سے بھی بہت سے نمونے آئے تھے۔ دستکاری، زردوزی، کشیدہ کاری اور خطاطی کے بعض نمونے بیگم بھوپال کی طرف سے تھے۔ پٹیالہ کی رانی نے دستکاری کے نمونے ارسال کئے، مہاراجہ بھاؤ نگر نے انعامات تقسیم کرنے کے لئے دوسو پچاس روپیہ، شہزادی منوہر کنور نے مخمل پر کشیدہ کاری کیا ہوا فریم، شہزادی بھاؤ نگر کی معلمہ کا بنایا ہوا روغنی تصویر کا ایک خاکہ بھی نمائش میں پیش کیا گیا۔ اس کانفرنس میں بڑی تعداد میں خواتین شریک ہوئیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ رسالہ "خاتون" کے ذریعہ سے زنانہ کانفرنس اور نمائش کی بہت تشہیر کی گئی تھی۔

مستورات کے لئے موجودہ ایس ایس ہال میں واقع نظام میوزیم کے چاروں طرف پردے کا انتظام کیا گیا۔ شاہ پور جی کی کوٹھی میں زنانہ کانفرنس کا اہتمام کیا گیا اور کوٹھی کے چاروں طرف دوہری قناتیں کھڑی کی گئیں۔ 29/دسمبر کی شب کا اجلاس شعبۂ نسواں کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔

اس اجلاس میں تعلیمِ نسواں کے سکریٹری کی حیثیت سے شیخ عبداللہ کی رپورٹ میں ان کوششوں کا تذکرہ کیا گیا جو انہوں نے انجام دی تھیں... مسلم قائدین کی ایک بڑی تعداد نے شیخ عبداللہ کی رپورٹ پر تنقید کی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ نارمل اسکول وجود میں نہ لا سکے۔ سب سے زیادہ مخالفت سید ممتاز علی نے کی جو تعلیمِ نسواں کے سکریٹری کی حیثیت سے پہلے ہی برطرف کر دیئے گئے تھے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے کہا کہ ممتاز علی صاحب کی تقریر نے

بحث کا موضوع بدل دیا۔ ہم یہاں شیخ عبداللہ کی رپورٹ کو سننے اور اس پر بحث کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ تعلیمِ نسواں کے لئے ان کی قابلِ قدر خدمات، نئے رسالہ کا اجرا، چندہ اکٹھا کرنا اور عورتوں کی دستکاری کی نمائش کا انعقاد وہ کارنامے ہیں جن کی دل کھول کر تحسین کی جانی چاہئے بجائے اس کے کہ ان کو بدنام کیا جائے اور تنقید کا نشانہ بنایا جائے۔

30 / دسمبر کی شام کو اجلاس ختم ہونے کے بعد جیسے ہی شیخ محمد عبداللہ اسٹریچی ہال سے باہر نکلے تبھی مولانا شوکت علی نے پیچھے سے ان کے کندھے پر ایک مکّا رسید کر دیا۔ انہوں نے دوسرا ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ مندوبین نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ اس واقعہ سے حاضرین میں ایک تہلکہ مچ گیا اور کالج کے تمام ٹرسٹی نواب سر فیاض علی خاں کی کوٹھی پہاسو ہاؤس پر جمع ہوئے اور فیصلہ کیا کہ شوکت علی کو ٹرسٹی شپ سے ان کی نازیبا حرکت پر ہٹا دیا جائے۔ علی گڑھ کے اولڈ بوائز نے بھی اسٹریچی ہال میں جلسہ منعقد کر کے اس واقعہ کی مذمت کرتے ہوئے ان کو ٹرسٹی شپ سے ہٹانے کی مانگ کی اور یہ بھی فیصلہ کیا کہ اگر وہ ٹرسٹی شپ سے علیحدہ نہیں ہوں گے تو ان کو اولڈ بوائز کی جماعت سے بھی خارج کر دیا جائے گا۔ اس واقعہ کی پورے ملک میں بہت شہرت ہوگئی اور لوگوں نے شیخ صاحب کے لئے کہنا شروع کیا کہ ''یہ تو تعلیمِ نسواں پر اپنی جان تک دینے کے لئے تیار ہے'' (22)

ایم اے او کالج کے پرنسپل مسٹر آرچبولڈ بھی تعلیمِ نسواں کے اسکول کو ایم اے او کالج کی صحت کے لئے مضر خیال کرتے تھے۔ انہوں نے علی گڑھ میں لڑکیوں کے کالج کی سخت مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ کالج کے اس قدر قریب گرلس اسکول کا قیام طلباً کی بدنظمی کا باعث ہوگا اور مسلم قوم کی نظر میں علی گڑھ کالج کا مقصد مجروح ہوگا۔ انہوں نے یہاں تک دھمکی دے ڈالی کہ اگر یہ کالج یونیورسٹی احاطے کے پاس قائم کیا جائے گا تو وہ بطور احتجاج پرنسپل شپ سے استعفیٰ دے دیں گے۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین بھی اسی خیال کے حامی تھے۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ اگر لڑکیوں کا کالج قائم کرنا ہی ہے تو شہر کے دوسری طرف کھولا جائے تا کہ لڑکیوں کے اس اسکول کی فضا سے ایم اے او کالج کی فضا مکدر نہ ہو سکے۔ کالج کے اعزازی سکریٹری وقار الملک اس کی وضاحت کے لئے شیخ عبداللہ سے ملے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ کالج کے اسٹاف اس کے کیمپس میں یا اس کے آس پاس اپنی بیوی اور فیملی کے ساتھ رہتے ہیں اور کوئی اس کے بارے میں نہیں

سوچتا۔ اب اگر اس کالج سے کئی فرلانگ دور ایک ایسا گرلس اسکول قائم ہو جائے جو مضبوط اور اونچی دیواروں سے گھرا ہوا ہو اس سے کیا فرق پڑے گا؟ غرض وقار الملک شیخ صاحب کے دلائل سے مطمئن ہو گئے۔

1906ء میں انہوں نے اتر پردیش کے لیفٹیننٹ گورنر کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی۔ مسلمانوں میں لڑکیوں کی تعلیم کی طرف سے اس قدر غفلت ہے کہ ملک کے کسی بھی حصہ میں مسلم لڑکیوں کا ایک بھی اسکول نہیں ہے۔ ہم علی گڑھ میں ایک مدرسہ قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن گورنمنٹ کی اعانت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے ایک وفد کو اپنی عرضداشت پیش کرنے کا موقعہ فراہم کرایا جائے۔ گورنر کے دفتر سے وفد کے نام طلب کئے گئے جس پر تمام اکابرینِ ملت نے اپنی منظوری دے دی کہ ہم ضرور شریک ہوں گے۔ جن لوگوں نے گورنر سے ملاقات کے لئے اپنی تحریری منظوری دی تھی ان میں نواب محسن الملک، نواب سر فیاض علی خاں، نواب مزمل اللہ خاں، نواب راجہ تصدق رسول جہانگیر آباد، مہاراجہ سر علی محمد خاں آف محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، راجہ نوشاد علی خاں جہانگیر آباد، مولوی محمد وسیم ایڈووکیٹ لکھنؤ اور خواجہ غلام الثقلین وکیل لکھنؤ شامل تھے۔

گورنر سر جیمس لاٹوش نے 6 راگست 1906ء کی تاریخ مقرر کر دی مگر ہر شخص نے کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر کے جانے سے انکار کر دیا۔ صرف راجہ نوشاد علی، خواجہ غلام الثقلین اور مولوی محمد وسیم ہی گورنر ہاؤس پہنچے۔ گورنر نے پہلا سوال یہی کیا کہ اتنے بڑے بڑے لوگ جنہوں نے آنے کا وعدہ کیا تھا وہ کیوں نہیں آئے۔ جس پر شیخ عبداللہ نے کہا کہ لوگوں کو یہ عادت ہو گئی ہے کہ جس بات میں گورنمنٹ کی توجہ ہوتی ہے تو پھر وہ اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اگر حضور والا تھوڑی سی توجہ مبذول فرمائیں گے تو ہمارے رؤسا جو آج اس وفد میں شریک نہیں ہوئے وہ دوڑ کر آئیں گے اور آکر عرض کریں گے کہ ہم تو دل سے اس تحریک کے ساتھ ہیں۔ گورنر نے کہا کہ اگر آپ مدرسہ قائم کریں تو سرکار پوری مالی امداد کرے گی۔ بغیر مدرسہ کے کوئی گرانٹ ملنے کا قاعدہ نہیں ہے۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ پہلے جا کر مدرسہ قائم کیجئے اور سرکار آپ کو گرانٹ دے گی۔

لہٰذا شیخ صاحب اور ان کے دوست مولوی احتشام الدین اور عظمت علی صاحب لکھنؤ

میں مسلم استانی کی تلاش کو نکل پڑے مگر پورے شہر میں ایک بھی مسلم خاتون ایسی نہ نکلی جو علیگڑھ آ کر مدرسہ قائم کر سکے۔ کسی صاحب نے ڈاکٹر رقیہ بیگم کا پتہ بتایا۔ وہاں تلاش کرنے پر ان کے گھر کے برامدے میں ایک ڈھولک ٹنگی ہوئی تھی۔ غرض لکھنؤ کے بعد علی گڑھ میں بھی استانی کو تلاش کیا اور پھر بیگم عبداللہ کو لے کر دلی چلے گئے اور وہاں بھی ایک بھی ایسی تعلیم یافتہ عورت نہ ملی جو علی گڑھ آنے کے لئے تیار ہو۔

بمشکل تمام ایک استانی کے بارے میں علم ہوا کہ وہ قرآن شریف پڑھا سکتی ہے اور اردو بھی جانتی ہے لیکن وہ دلی چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ تلاش کرتے کرتے اس کے مکان تک پہنچ گئے مگر اس نے بھی علی گڑھ جانے سے انکار کر دیا اور کافی خوشامد کرنے پر اس شرط پر راضی ہو گئی کہ اگر اس کے پورے خاندان کو بھی ساتھ جانے کی اجازت دی جائے۔ اس نے بتایا کہ میرا شوہر، میری لڑکی اور میری ماں ہے۔ میں جہاں رہوں گی وہ بھی میرے ہی ساتھ رہیں گے۔ شیخ عبداللہ نے اس عورت کی شرط منظور کر لی۔ چنانچہ اختری بیگم نامی استانی اور اس کے تمام کنبے کو لے کر دلی سے علی گڑھ چلے آئے اور علی گڑھ شہر کے اوپر کوٹ علاقہ کے محلّہ ٹن ٹن پاڑہ میں کالج کیمپس سے بہت دور دو روپیہ ماہانہ کے کرایہ کے مکان میں ان کو رکھ دیا اور جس طرح چھوا چھوت کے ہسپتال شہر سے باہر کھولے جاتے ہیں اسی طرح یہ زنانہ اسکول بھی پرانے شہر میں قائم ہو گیا۔ محلّہ کی قرب و جوار کی لڑکیاں استانی سے آ کر قرآن شریف پڑھنے لگیں لیکن باقاعدہ طور پر اسکول کا آغاز 1907ء میں ہوا اور دو ڈولیاں لڑکیوں کو لانے کے لئے مقرر کی گئیں جن پر چھ کہار ملازم رکھے گئے اور اختری استانی کے شوہر کو چوکیداری اور نگرانی کے کام پر لگا دیا گیا۔ استانی کی لڑکی کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا اور ان کی ماں کو تختیاں دھونے کے کام پر مقرر کیا گیا۔ غرض کہ اختری استانی کا پورا کنبہ اس اسکول میں کام کرنے لگا۔ وحید جہاں بیگم، ان کی دونوں بہنیں سکندر جہاں بیگم اور سعید جہاں بیگم روزآنہ چھتاری کمپاؤنڈ میں اپنے چھوٹے بچوں کو نوکروں کے حوالے کر کے ٹن ٹن پاڑہ محلّہ کے اس اسکول میں لڑکیوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے آتی تھیں۔ وہ طالبات کو اپنی بیٹیاں سمجھتی تھیں اور جب ان کو یہ معلوم ہوتا کہ کچھ غریب بچیاں اپنا کھانا نہیں لا سکیں تو انہیں لنچ میں شریک کر لیتیں اور اکثر خود بھوکی رہ جاتیں۔ (23)

اس اسکول کے قیام سے لیفٹیننٹ گورنر کو مطلع کر دیا گیا اور خاتون انسپکٹر آف اسکول کی رپورٹ کے ڈیڑھ ماہ بعد ہی سترہ ہزار یکمشت اور ڈھائی سو روپیہ ماہانہ کی گرانٹ ملنے لگی۔ لڑکیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے ساتھ ساتھ ڈولیوں کی تعداد بھی بڑھادی گئی اور اس مکان کے ایک حصہ کو بورڈنگ ہاؤس میں تبدیل کر دیا گیا اور اختری استانی کی والدہ ان کی نگرانی کرنے لگیں۔ اسکول کی ترقی کے ساتھ ساتھ شہر کے نوجوان مجنوؤں کی تعداد میں بھی اضافہ ہونے لگا اور جب ڈولیاں گزرتیں تو یہ منچلے لڑکے پردہ اچھال کر لڑکیوں کو پریشان کرنے لگے جس پر شیخ محمد عبداللہ نے دیوار سے پیچھے بیٹھ کر اس نازیبا حرکت کرنے والے لڑکوں کو پکڑ لیا اور قینچیوں سے پٹائی شروع کر دی۔ اس کے بعد پھر کسی کی ہمت نہیں ہوئی۔ بالائے قلعہ کے جس علاقے میں یہ اولین اسکول قائم کیا گیا وہ عمارت اب بھی اسی حالت میں ہے اور شیخ عبداللہ نے جب اس مکان کو خالی کر دیا تو بہت عرصے تک بلقیس آپا نے سراج العلوم نسواں کالج کے نام سے اس اسکول کو چلایا مگر ان کے پاکستان چلے جانے کے بعد یہ مکان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اصل مکان سعید منزل ہے جب کہ مکان کے دوسرے حصہ کو داروغہ ریاض محمد خاں صاحب نے خرید لیا۔ داروغہ جی کے دو صاحبزادے فیاض رفعت صاحب دوردرشن لکھنؤ کے ڈائرکٹر رہ چکے ہیں جب کہ دوسرے بیٹے اشفاق محمد خاں صاحب پریس ٹرسٹ آف انڈیا (پی ٹی آئی) کے بیورو چیف ہیں اور راقم الحروف کا ہر ہفتہ اس مکان میں جانا ہوتا تھا۔ داروغہ جی کی تینوں بیٹیوں نے بھی گرلس ہائی اسکول اور ویمنس کالج سے تعلیم پائی ہے اور سب سے بڑی بیٹی مختار آپا سرکاری اسکول میں ٹیچر ہیں۔

1910ء میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے اس اسکول کو محلّہ بنی اسرائیلان کے ایک کرایہ کے مکان میں منتقل کر دیا گیا بعد میں یہ اسکول اپنی اصل عمارت میرس روڈ پر شفٹ کر دیا گیا۔ بنی اسرائیلان کے اس اسکول میں بھی شیخ صاحب نے جب مکان خالی کر دیا تو میونسپل بورڈ نے اسکول نمبر 16 کے نام سے بہت عرصہ تک اسکول چلایا مگر اب یہ جگہ مکان مالک کو حاصل ہو گئی ہے اور مسلم یونیورسٹی کے ایک ریٹائرڈ ملازم حبیب اسرائیلی نے ایک شادی گھر ''الریحان'' کے نام سے قائم کر دیا ہے۔

7/نومبر 1911ء کو یوپی کے قائم مقام لیفٹیننٹ گورنر مسٹر پورٹر کی بیگم نے تعلیمِ نسواں

کے اسکول کی سب سے پہلی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا اور یہ عمارت وحیدیہ ہاسٹل کے ڈائننگ ہال کی تھی جہاں آج بھی کتبہ نصب ہے۔ بانیٔ مدرسہ نے اسکول کے بجائے پہلے بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر کرائی کیونکہ اگر اسکول تعمیر ہوتا تو باہر سے آنے والی لڑکیوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہوگی۔ اس لئے ہاسٹل کی تعمیر کو اولیت دی جس پر بعض لوگوں نے اعتراضات بھی کئے اور کہا کہ ''آپ کو گھوڑا خریدنا چاہئے لیکن آپ اس کا چابک خرید رہے ہیں۔ ہر جگہ سب سے پہلے مدرسہ قائم ہوتا ہے اور پھر بورڈنگ ہاؤس۔ لیکن آپ پہلے بورڈنگ ہاؤس تعمیر کر رہے ہیں اور اس کے بعد اسکول تعمیر کرائیں گے''۔ 14رفروری 1914ء کو والیٔ بھوپال سلطان جہاں بیگم نے اپنے دستِ مبارک سے وحیدیہ ہاسٹل کا افتتاح کیا اور پہلے دن ہی نو لڑکیاں ہاسٹل میں داخل ہوئیں۔ لڑکیوں کے اس ہاسٹل میں پردے کا خاص انتظام کیا گیا اور دیواروں کو جیل خانے کی دیوار کی طرح بنایا گیا جہاں پرندہ بھی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی مرد کو ہاسٹل میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف صفائی والا اور پانی والا سقہ ہی اندر جا سکتے تھے۔ بعض والدین کو اس پر بھی اعتراض تھا اور دو والدین اپنی لڑکیوں کو صرف اسی وجہ سے واپس اپنے گھر لے گئے۔ اس پہلے ہاسٹل کی افتتاحی تقریب میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے جو شریف خواتین شرکت کے لئے تشریف لائیں ان میں علی گڑھ کی خواتین کے علاوہ بمبئی سے فیضی بہنیں اور بھوپال سے مولانا ابوالکلام آزاد کی بہن آبرو بیگم، لاہور سے سر میاں محمد شفیع کی بیگم اور ان کی دختر، بیگم شاہنواز بھٹو (پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی والدہ)، لکھنؤ، پنجاب اور حیدر آباد سے دیگر معزز خواتین نے حصہ لیا۔

بیگم بھوپال نے اپنی افتتاحی تقریر میں اشارہ کیا کہ ہال کے دروازے جو کھولتے وقت پھنس گئے تھے وہ اس بات کے غماز ہیں کہ مسلم لڑکیوں کی تعلیم کی راہ میں اب بھی رکاوٹوں کا سامنا ہے۔(24)

اس سلسلے میں فرح نظامی لکھتی ہیں کہ ''جب بیگم صاحبہ نے بورڈنگ میں داخل ہونے کی کوشش کی تو انہوں نے اس کا تالہ تو کھول لیا لیکن اس کا کواڑ نہ کھول سکیں جو بالکل نیا تھا۔ کافی کوشش کے بعد بیگم عبدالمجید خواجہ اس کو کھولنے میں کامیاب ہوئیں لیکن اس کوشش میں وہ زخمی ہو گئیں۔ اس موقعہ پر بیگم جنجیرہ نے یہ تبصرہ کیا ''خواتین'' غور کیجئے یہ عورتوں کی تعلیم کے دروازے

ہیں، ہم ان کو کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگرچہ اس کے لئے کافی طاقت لگانی پڑی اور دقت پیش آئی۔'' (25)

ہاسٹل کے افتتاح کے بعد پہلے دن جو نو لڑکیاں ہاسٹل میں داخل ہوئیں ان میں تین خود ان کی صاحبزادیاں تھیں، تین بیگم عبداللہ کی منجھلی بہن کی لڑکیاں تھیں اور ایک عبداللہ بیگم کی دوست میمونہ بیگم بلند شہر کی لڑکی تھی۔ دو اور لڑکیاں تھیں جن کی سرپرستی اور پرورش کئی سال سے بیگم عبداللہ خود کر رہی تھیں۔ ان لڑکیوں کو داخل کرنے کے بعد وحید جہاں بیگم دن رات ہاسٹل میں وارڈن کے طور پر رہنے لگیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ دور دور تک آبادی نہیں تھی اور اتنے بڑے احاطے میں لڑکیوں کو اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ بہت سے والدین کو اس سے بہت اطمینان ہوا اور لڑکیوں کی تعداد میں بھی بہت تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ خود میر ولایت حسین نے بھی اپنی صاحبزادیوں کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیا اور ان لڑکیوں نے اسی اسکول سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔

ہاسٹل کے ابتدائی دنوں میں لڑکیوں کی ماؤں کو بھی ہاسٹل میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی تاکہ وہ خود اس اقامتی زندگی کے بارے میں مطمئن ہو سکیں۔ ان لڑکیوں کی مائیں دیکھتی تھیں کہ بیگم عبداللہ کس طرح غیر لڑکیوں کو اپنی بیٹی کی طرح رکھتی ہیں تو بڑے اطمینان سے اپنی لڑکی کو بھی عبداللہ بیگم کے سپرد کر دیتیں تھیں اور کہتی تھیں کہ ''لو بی بی لڑکی کو اللہ پر چھوڑا اور تمہارے سپرد کیا۔ اب ہمارے خاندان کی لاج تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' بیگم عبداللہ کے لئے یہ بہت ایثار اور قربانی تھی کہ وہ اپنے میاں اور بچوں کو چھوڑ کر ہاسٹل کے ایک کمرے میں رہتی تھیں۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ ''کل ہندوستان میں اس وقت مسلم لڑکیوں کا ایک یہی دارالاقامہ تھا۔'' (26)

لڑکیوں کی تعداد کے ساتھ ساتھ تعلیمی مدارج میں ترقی ہونی شروع ہوئی۔ جب تک مدرسہ شہر میں تھا اس وقت تک پرائمری سطح کی تعلیم ہوتی تھی لیکن بورڈنگ ہاؤس کے قیام کے بعد یہ اسکول ترقی کے منازل طے کرنے لگا اور 17-1916ء کے تعلیمی سال میں تین لڑکیاں اینگلو ورنا کیولر مڈل کے امتحان میں شریک ہوئیں اور سبھی امتیازی نمبروں سے پاس بھی ہوئیں۔ لڑکیوں میں تعلیم کا چلن بڑھنے لگا اور ان کی خواہش تھی کہ اب وہ میٹرک بھی پاس کریں جس کے لئے تعلیم

یافتہ استانیوں کی ضرورت تھی۔ اس زمانے تک کسی بھی طالبہ سے رہنے، کھانے اور پڑھنے کی کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی اور بیگم عبداللہ ہر مہینے اپنے شوہر سے پیسہ وصول کرتی تھیں۔ بعد میں نظام حیدرآباد، نواب ٹونک، نواب بھاول پور اور نواب بھوپال نے فیاضانہ عطیہ فراہم کیا اور خود یوپی سرکار نے بھی تین ہزار روپیہ سالانہ امداد میں اضافہ کر کے سات آٹھ ہزار روپیہ سالانہ کر دی۔ اس کے بعد ہی ایم اے، بی اُے پاس استانیوں کو مقرر کیا گیا اور اس اسکول کی لڑکیاں مڈل اور میٹرک دونوں امتحانات میں شریک ہونے لگیں۔

1921ء میں اس اسکول نے ہائی اسکول کا درجہ حاصل کر لیا اور یوپی بورڈ کے امتحانات میں چند طالبات شریک ہوئیں اور سبھی کامیاب ہوگئیں۔ امتحان میں اچھی کارکردگی کے سبب چند طالبات نے اسکالرشپ بھی حاصل کی۔ جولائی 1922ء میں تین لڑکیاں ہائی اسکول کے امتحان میں کامیاب ہوئیں ان میں سے دو خود شیخ عبداللہ کی صاحبزادیاں تھیں اور ایک جج خان بہادر محمد حسین کی بیٹی۔ (27)

22 مئی 1951ء میں شیخ عبداللہ نے اپنی جائیداد کو ویمنز کالج اور گرلس ہائی اسکول کے لئے وقف کر دیا۔

شیخ عبداللہ کی شریک کار بیگم وحید جہاں روزانہ صبح سے ہی اسکول میں پہنچ جاتیں اور تدریسی کاموں کی نگرانی کرتیں اور کوئی لڑکی بیمار ہو جاتی تو خود اس کی تیمارداری کرتی تھیں۔ اگر وہ عیسائی مذہب میں پیدا ہوتیں تو انہیں مدر ٹریسا کی طرح نوبل انعام کا مستحق قرار دیا جاتا۔ ان کی پوری زندگی خدمتِ خلق سے عبارت تھی۔ اس زمانے میں شہر میں پلیگ کا بہت زور تھا۔ پلیگ کا شبہہ ہونے پر عام لڑکیاں بیمار لڑکی کے پاس جانے سے ڈرنے لگی تھیں مگر بیگم عبداللہ رات رات بھر اس ایک بیمار لڑکی کو اپنی گود میں لئے بیٹھی رہتیں۔ وہ کہتی تھیں کہ ''اگر پلیگ کی بیماری لگ بھی گئی تو مرنا تو ایک ہی بار ہے۔ کم سے کم لڑکی کے دل میں تو ایک ڈھارس پیدا ہوگی کہ اس کی بغیر ماں کے بھی اس کو کوئی پریشانی نہیں ہو رہی۔'' ایکزیکیٹو کونسل کے ایک جلسہ میں شیخ صاحب نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''عورتوں میں کتنا ایثار ہوتا ہے۔ اگر ہماری یونیورسٹی کا کوئی لڑکا پلیگ میں مبتلا ہو جاتا تو کوئی افسر یا استاد اس کو اس طرح سے گود میں لے کر نہ بیٹھتا۔'' (28)

شیخ محمد عبداللہ اور ان کی بیگم کو اس وقت کے حالات کے پیش نظر لڑکیوں کے پردے کا خاص خیال تھا۔ شہر کی لڑکیوں کے لئے بس اور گھوڑا گاڑیوں کا انتظام تھا۔ ایک مرتبہ راستے میں بس خراب ہوگئی تو وہ خود لڑکیوں کو لینے کے لئے ان کے گھر تک پہنچ گئیں۔ وہ ہاسٹل میں رہنے والی لڑکیوں کے نام تمام خطوط پہلے اپنے پاس منگاتی تھیں اور والدین کی تحریر کے نمونے ملا کر ہی یہ خطوط لڑکیوں کو دیتی تھیں۔ ایک مرتبہ خود انہوں نے اپنی صاحبزادی خورشید مرزا کا خط بھی چیک کیا جس کا حال خود خورشید مرزا نے بڑے ہی دلچسپ انداز میں کیا ہے۔(29)

اتر پردیش کے وزیر تعلیمات مسٹر سمپورنانند، جو اپنی اردو دشمنی کی وجہ سے مسلمانوں میں بہت ناپسندیدہ تھے، 1938ء میں اس کالج میں تشریف لائے اور بورڈنگ ہاؤس کا معائنہ کیا تو انہوں نے برجستہ کہا کہ "انہیں شک تھا کہ پردے کے پیچھے نہ معلوم کس طرح کا انتظام ہوگا لیکن آج یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پردے کے اندر رہ کر بھی لوگ کس صفائی اور خوش اسلوبی سے رہ سکتے ہیں" اور اس کالج کے حسنِ انتظام سے متاثر ہو کر بیس ہزار روپیہ عمارت کی تعمیر اور بورڈنگ ہاؤس کی امداد کے لئے دو ہزار روپیہ سالانہ کی گرانٹ مقرر کر دی۔

شیخ محمد عبداللہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ "میں نے کسی رئیس کو بجز نواب سر فیاض علی خاں اور نواب سر مزمل اللہ خاں کے موجودہ زمانے کی عام ضرورتوں یا تعلیمی مقاصد کے لئے کوئی بڑی رقم عطا کرتے نہیں دیکھا... ہمارے رئیسوں کو لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق ایک تعصب ہے۔ اس کے لئے وہ تعلیمِ نسواں پر روپیہ خرچ کرنا گناہ یا نیم گناہ سمجھتے ہیں۔ اب کچھ زمانے سے اپنی لڑکیوں کو علی گڑھ کے مدرسے میں تعلیم کے لئے بھیجنے لگے ہیں گو اس کو بھی وہ اپنے دل میں گناہ ہی سمجھتے ہوں گے لیکن اپنی جیب سے مدرسے کے لئے کچھ دینا تو ایک گناہ ضرور ہے۔"

سر ولیم میرس کی گورنری کے دور میں انٹرمیڈیٹ کے کھولنے کا مسئلہ پیش آیا تھا۔ سر ولیم میرس علی گڑھ میں کلکٹر بھی رہ چکے تھے اور شیخ محمد عبداللہ کی پرکشش شخصیت اور ان کے کارناموں سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے انٹر کلاسیز کھولنے میں بہت مدد کی اور سرکاری گرانٹ میں بھی دوگنا اضافہ کر دیا اور پچاس ہزار سے زائد رقم جدید ہاسٹل کی تعمیر کے لئے دی۔ سلطانیہ ہاسٹل اسی رقم سے تعمیر کیا گیا اور اس طرح شیخ صاحب کی زندگی میں دو ہاسٹل تعمیر ہو چکے تھے۔ اس طرح

1926ء میں انٹر میڈیٹ کے امتحان میں لڑکیوں کو شرکت کے لئے بھیجا جانے لگا اور 1929ء میں یو پی بورڈ نے اس اسکول کو انٹر کالج کے طور پر منظوری دے دی۔ حالانکہ شیخ محمد عبداللہ اس کالج کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے الحاق چاہتے تھے اور 1939ء میں لڑکیوں کے اس کالج کا یونیورسٹی سے الحاق ہو گیا (30) طالبات کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر یہ ضروری سمجھا گیا کہ بی اے کی کلاسیز بھی شروع ہوں۔

1935ء میں رامپور میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس سید حسین بلگرامی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ شیخ عبداللہ نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی اور علی گڑھ میں لڑکیوں کے ڈگری کالج کے قیام کی تجویز پیش کی۔ کئی مندوبین نے اس تجویز کی حمایت کی لیکن یہ تجویز منظور نہیں کی گئی۔ شیخ عبداللہ نے تعلیمِ نسواں کے مخالفین کی مذمت کرتے ہوئے تعلیمِ نسواں کی ضرورت پر مضامین لکھے۔ جب سر شاہ محمد سلیمان نئے وائس چانسلر مقرر ہوئے تو انہوں نے شیخ صاحب کی درخواست پر ویمنز کالج کے قیام کو اپنی منظوری دے دی۔ اس کے ساتھ ہی یونیورسٹی انتظامیہ نے پانچ ہزار روپیہ کی سالانہ گرانٹ بھی 38-1937ء میں منظور کر دی اور بی اے کلاسیز بھی شروع ہو گئیں۔ بعد میں یونیورسٹی نے لڑکیوں کو پی جی کلاسیز میں داخلے کی منظوری دے دی۔

(File No.41/3 1939 - 40 - A A.)

پی جی کورسیز میں داخل ہونے والی لڑکیوں کی رہائش کے لئے اسی اقامتی ہال میں انتظام کیا گیا۔ لڑکیوں کے لئے اس ویمنز کالج کے قیام کے لئے یونیورسٹی کے آئین میں ترمیم کا بل پارلیامنٹ کے موسمِ سرما کے اجلاس میں نومبر میں پیش کیا گیا۔ سر محمد یعقوب اور مسٹر پی این سپرو نے اس بل کی پر زور حمایت کی جب کہ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو نے بل کی مخالفت تو نہیں کی مگر یہ تجویز پیش کی کہ لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی مسلم یونیورسٹی میں تعلیم کے یکساں مواقع فراہم کئے جانے چاہئیں اور لڑکیوں کے لئے علیحدہ کالج کی ضرورت نہیں ہے۔ مسلم یونیورسٹی کا یہ ترمیمی بل بغیر کسی مزید بحث کے منظور کر لیا گیا (31)

یونیورسٹی انتظامیہ کی جانب سے ویمنز کالج کو جو پانچ ہزار روپیہ سالانہ کی گرانٹ ملتی تھی وہ اس کالج کے لئے ناکافی تھی۔ شیخ صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ویمنز کالج کے الحاق کو

ختم کردیا اور اپنے ہم جماعت ڈاکٹر سر ضیاءُ الدین سے جو ان دنوں صوبائی اسمبلی کے رکن تھے، ان کی مدد سے ایک مرتبہ پھر یو پی سرکار سے رجوع کیا اور مسلم یونیورسٹی کا یہ ویمنز کالج اتر پردیش کی امداد میں شامل ہوگیا۔ اتر پردیش سرکار نے 1944ء میں اٹھارہ ہزار پانچ سو روپیہ کی امداد فراہم کرائی اور ویمنز کالج کی مجلس انتظامیہ اس کالج کے نظم ونسق کو تقسیم ملک تک انجام دیتی رہی۔

1944ء تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایم اے، بی ٹی اور دوسرے پوسٹ گریجویٹ کورسوں کی لڑکیوں کو عورتوں کے اقامتی ہال میں ٹھہرایا جاتا تھا لیکن 1944ء میں جب اس ویمنز کالج کا یو پی سرکار سے الحاق ہوگیا تو اس اقامتی ہال کے دروازے پوسٹ گریجویٹ طالبات کے لئے بند کردئے گئے اور ان خواتین کی تعلیم یونیورسٹی میں ہونے لگی اور یونیورسٹی کی کلاسوں میں پردے کا خاص انتظام بھی کیا گیا۔

ہندوستان کے پہلے وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد جب 20 رفروری 1949ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی وائس چانسلر شپ میں تقسیم اسناد کا خطبہ دینے کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تشریف لائے اس وقت شیخ محمد عبداللہ نے انہیں ویمنز کالج میں بھی مدعو کیا اور ویمنز کالج کی مالی دشواریوں کے بارے میں انہیں مطلع کیا جس پر مولانا آزاد نے اس ویمنز کالج کی کارکردگی سے متاثر ہوکر نو لاکھ روپیہ سالانہ کی گرانٹ کے ساتھ یونیورسٹی بجٹ میں شامل کرنے کا وعدہ کیا اور اس پر عمل بھی کیا اور اس طرح اتر پردیش سرکار سے اپنا رشتہ ختم کر کے اب یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ہی ایک ادارہ بن گیا اور 1949ء کے بعد سے یہ ادارہ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ نئی نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں، نئے نئے کورس شروع کئے گئے۔

اردو کے ممتاز ناقد پدم بھوشن پروفیسر آل احمد سرور شیخ عبداللہ کی خدمات پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''سر سید لڑکوں کی تعلیم زیادہ ضروری سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکے تعلیم یافتہ ہوں گے تو لڑکیاں بھی ان کے اثر سے ترقی کرنے لگیں گی، شیخ عبداللہ نے لڑکیوں کی تعلیم کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا۔ سخت مخالفت کے ماحول مین انہوں نے ایک اسکول کی بنیاد ڈالی جو رفتہ رفتہ انٹر کالج اور پھر ڈگری کالج بنا۔ ان کی بیگم جو اعلیٰ بی کہلاتی تھیں اس تعلیمی مہم میں ان کی دست راست تھیں۔ سر سید کے دور کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں جو ایک قومی جذبہ، ایک

دردمندی اور ایک خدمت کی لگن تھی وہ شیخ عبداللہ میں بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اردو زبان کی بقاؑ اور ترقی کے لئے بھی انہوں نے سعی بلیغ کی جب ملتے تھے تو اکثر مسلمانانِ ہند کے حالات پر گفتگو ہوتی تھی۔ (32)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ سرجری کے پروفیسر اور ''جوابِ دوست'' کے مصنف ڈاکٹر نسیم انصاری شیخ عبداللہ کی شاندار خدمات پر اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں کہ

''سرسید کے شاگردوں میں ایک دیوانہ اور پیدا ہوا، نام شیخ عبداللہ تھا۔ اس زمانے میں جاہل لوگ اپنی لڑکیوں کو اس ڈر سے لکھنا پڑھنا نہیں سکھاتے تھے کہ کہیں وہ بڑی ہو کر خط نہ لکھنے لگیں۔ شیخ عبداللہ نے جہالت کی اس کالی چادر کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔ آج اس شاندار کالج میں بیٹھ کر ذرا اس زمانے کا تصور کیجئے جب لڑکیاں ڈولیوں پر پردہ ڈال کر اسکول میں بھیجی جاتی تھیں اور اگر ڈولی کے پردہ سے ان کے دوپٹہ کا ایک کونہ بھی باہر آجاتا تھا تو شہر والے آفت مچادیتے تھے۔ کیا کیا باتیں نہیں سننا پڑیں، شیخ عبداللہ کو! لیکن اس ہمت والے نے سب کچھ سنا، سب کچھ برداشت کیا لیکن اپنے پیروں میں لغزش نہ آنے دی، آج اس کے مدرسہ کی پڑھی ہوئی لڑکیاں وکیل ہیں، ڈاکٹر ہیں، سرجن ہیں، انجینیئر ہیں، یونیورسٹیوں میں پروفیسر اور حکومت میں وزیر ہیں۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ شیخ عبداللہ نے حالات کے سامنے سپر نہیں ڈالی بلکہ یہ کہا کہ انسان اشرف المخلوقات اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے گردوپیش کے حالات کو بدلنے کی قدرت بھی رکھتا ہے اور اس کا کمال یہی ہے کہ وہ اندھیرے کو روشنی میں بدل دے۔'' (33)

شیخ محمد عبداللہ کی تعلیمِ نسواں کے میدان میں ملّی اور قومی خدمات پر انہیں اعزازات سے بھی نوازا جاتا رہا۔ 1904ء میں انہیں ایم اے او کالج کا ٹرسٹی مقرر کیا گیا۔ وہ یونیورسٹی کورٹ اور ایگزیکیوٹو کونسل کے ممبر بھی رہے۔ 1931ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے آنریری ٹریژرار کے منصب پر بھی فائز رہے۔ ان کی عوامی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے 1935ء میں انہیں خان بہادر کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ 1950ء میں خان بہادر شیخ محمد عبداللہ کو تعلیمِ نسواں کے میدان میں ان کی قائدانہ خدمات کے سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ آف لاؑ کی اعزازی ڈگری تفویض کی اور آزاد ہندوستان نے انہیں 1964ء میں اپنے سب سے بڑے

شہری اعزاز ''پدم وبھوشن'' سے نوازا۔

شیخ محمد عبداللہ کا خاندان علی گڑھ میں ایک روشن خیال اور ترقی پسند خاندان تصور کیا جاتا تھا۔ ان کی پہلی بیٹی رشید جہاں 25 / اگست 1905ء کو پیدا ہوئیں۔ وہ اپنے سات بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ انہوں نے 1929ء میں دلّی کے لیڈی ہارڈنگ کالج سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی اور سرکاری ملازمت اختیار کی اور 14 / اکتوبر 1932ء کو محمود الظفر سے ان کی شادی ہوگئی۔ انہوں نے کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور اپنی پوری زندگی اس پارٹی کے نام وقف کردی۔ ملک کی آزادی کے لئے ہڑتالیں کیں، جیل گئیں اور ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں کلیدی کردار ادا کیا۔ وہ اردو ادب کی پہلی ترقی پسند افسانہ نگار خاتون تھیں۔ انہوں نے بہت سے انگریزی اور اردو میں افسانے لکھے اور افسانوں کا مجموعہ ''انگارے'' جس میں ان کا مضمون بھی شامل تھا اس پر حکومت نے پابندی لگادی۔ کینسر کے موذی مرض میں 29 / جولائی 1952ء کو 47 سال کی عمر میں ان کا ماسکو (روس) میں علاج کے دوران انتقال ہوگیا اور وہیں دفن کی گئیں۔ اردو، ہندی اور انگریزی میں ان پر بہت سے مضامین اور کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔

شیخ عبداللہ کی دوسری بیٹی خاتون جہاں بھی بہت لائق خاتون تھیں۔ انہوں نے لندن کی لیڈس یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے والد کے قائم کردہ گرلس اسکول میں پرنسپل کے فرائض بھی انجام دیئے اور بعد میں کلکتہ کے ایک گرلس کالج میں پرنسپل ہوگئیں اور اسی دوران میاں ابو محمد لیث ذوالقمرین جو آسنسول کے رہنے والے تھے، ان سے شادی ہوگئی۔

شیخ عبداللہ کی تیسری بیٹی ممتاز جہاں ایک لائق منتظم تھیں۔ انہوں نے لکھنؤ سے ایم اے اور انگلینڈ کی برسٹل یونیورسٹی سے ٹیچنگ ڈپلوما کیا تھا۔ شعبۂ کیمیا کے پروفیسر کرنل حیدر خاں سے ان کی شادی ہوئی۔ وہ تیس برس تک ویمنس کالج کی پرنسپل کے فرائض انجام دیتی رہیں اور ان کی شخصیت ایک سایہ دار درخت کی مانند تھی۔ وہ ڈسپلن کی بہت پابند تھیں۔ ان کی بیٹی شہلا حیدر حکومتِ ہند کی وزارت اطلاعات ونشریات کے شعبۂ ڈی اے وی پی کی ڈائرکٹر بھی رہ چکی ہیں۔ ویمنس کالج کے تمام پروگراموں میں وہ برابر شریک ہوتی رہتی ہیں۔ مس شہلا حیدر کے چھوٹے

بھائی سلمان حیدر صاحب مختلف ممالک میں ہندوستان کے سفارت کار رہ چکے ہیں اور وزارتِ خارجہ کے سکریٹری کے اہم فرائض بھی انجام دے چکے ہیں۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ اور ایکزیکیٹو کونسل کے رکن بھی رہے ہیں۔

شیخ عبداللہ کے بیٹے محسن عبداللہ نے 1930ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ایس فزکس کے مضمون کے ساتھ ڈگری حاصل کی تھی پھر ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ محسن عبداللہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں اسٹوڈینٹس یونین کے کیبنیٹ کے رکن بھی تھے۔ انہوں نے وکالت کا پیشہ چھوڑ کر بمبئی کی فلم انڈسٹری میں ملازمت اختیار کرلی۔ شیخ عبداللہ نے اپنے بیٹے کے اس فیصلے کو پسند نہیں کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ ''وکالت چھوڑ جانے کی وجہ سے میرا اور ان کا اختلاف رہا اور اب تک ہے۔ کیونکہ فلم کا کام غیر مستقل ہے۔ روپیہ بھی کچھ زیادہ نہیں ملتا اور سوشل پوزیشن بھی کوئی شخص حاصل نہیں کرسکتا۔'' محسن عبداللہ کی بیوی شاہدہ نے بھی فلموں میں کام کیا اور نینا کے نام سے وہ اپنے دور کی ایک کامیاب ہیروئن تھیں۔ ان سے ایک لڑکا طارق عبداللہ پیدا ہوا جو ان دنوں کناڈا میں ہے اور اس خاندان کا اصل وارث ہے۔ شاہدہ نے اپنے میاں کو چھوڑ کر فلم پروڈیوسر مسٹر ڈبلیو زیڈ احمد سے شادی کرلی۔ محسن عبداللہ نے فلمی دنیا کی ایک اور لڑکی سے شادی کی۔ بدقسمتی سے وہ بھی ان کو چھوڑ کر پاکستان چلی گئیں۔ محسن عبداللہ نے اپنی زندگی کے آخری دن عبداللہ لاج میں گزارے اور یہیں انتقال بھی ہوا۔ میں ممتاز آپا اور محسن عبداللہ کے جنازوں میں شریک ہوا ہوں۔ شیخ عبداللہ نے جہاں تعلیمِ نسواں کے میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں وہیں اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے بہت سی کتابیں اور کتابچے بھی لکھے مگر محسن عبداللہ کی نمازِ جنازہ کے لئے کوئی مولوی تیار نہیں تھا کیونکہ انہیں کبھی کسی نے نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ خدا منشی شاہد حسین خاں صاحب کو غریق رحمت عطا کرے کہ انہوں نے ان کے کفن دفن کا انتظام کیا۔ اتنے بڑے باپ کے بیٹے کو کندھا دینے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی۔

شیخ عبداللہ کی پانچویں اولاد خورشید جہاں بہت ہی ذہین اور لائق تھیں۔ وہ 4/ مارچ 1918ء کو پیدا ہوئیں اور دسویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہی ان کی شادی اکبر مرزا سے ہوگئی۔ حالانکہ تعلیم یافتہ ماں اور باپ اس عمر میں شادی کے لئے راضی نہیں تھے مگر ڈاکٹر خورشید جہاں نے

گھر کا ماحول سازگار بنایا اور پندرہ سال کی عمر میں ان کی شادی ہوگئی۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہی انہیں گانے بجانے اور رقص کا شوق تھا۔ ان کے شوہر اکبر مرزا پولس میں سپرنٹنڈنٹ تھے لہٰذا آفیسرس کلب میں جا کر ناچنا گانا ان کا شوق بن گیا اور یہ شوق بمبئی کی فلم انڈسٹری تک لے گیا۔ انہوں نے بہت سی ہندوستانی فلموں میں ''رینوکا دیوی'' کے نام سے کام کیا اور بعد میں پاکستان کے ٹی وی سیریل کرن کہانی، زیر زبر پیش، پرچون والا، شمع، آگہی اور افشاں جیسے کامیاب ٹی وی سیریلس میں کام کیا۔ 1989ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی لائق بیٹی لبنیٰ کاظم نے خورشید مرزا کی یادوں پر ایک انگریزی کتاب A Woman of Substance سنہ 2005ء میں ہندوستان سے شائع کرائی۔

شیخ صاحب کی آخری بیٹی برجیس جہاں کی شادی احمد نظیر قدوائی سے ہوئی جو آئی سی ایس افسر تھے۔ وہ آسام کے چیف سکریٹری بھی رہ چکے تھے۔ ان کے بیٹے رشید خالد قدوائی کی شادی لینالعل سے ہوئی جو ہانگ کانگ شنگھائی بینکنگ کارپوریشن (HSBC) کی چیف ایکزیکٹو آفیسر ہیں اور ہندوستان کی سب سے زیادہ تنخواہ پانے والی خاتون ہیں۔ شیخ صاحب کی اولادوں میں صرف برجیس آپا ہی حیات ہیں اور وہی عبداللہ لاج کی اس وقت ٹرسٹی بھی ہیں۔ ویمنس کالج کے پروگراموں میں برابر حصہ لینے کے لئے دلّی سے آتی ہیں۔ مستقل سکونت دلّی میں اختیار کر رکھی ہے مگر علی گڑھ سے بھی رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ شیخ عبداللہ اور اعلیٰ بی کے پوتی پوتے اور نواسی نواسے بھی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور اپنے خاندان کا نام روشن کئے ہوئے ہیں۔

عبداللہ لاج میں اس وقت عبداللہ نرسری اور پرائمری اسکول چلتا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر اور ممتاز مورّخ پروفیسر مشیر الحسن نے بتایا کہ وہ خود عبداللہ نرسری کے طالب علم رہ چکے ہیں۔ میرے بیٹے طلحہ اسرار اور بیٹی ثوبیہ راحت نے بھی پانچویں کلاس تک اسی اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے۔ میری بیٹی نے آرکیٹکچر میں انجینئرنگ کیا ہے اور اب دلّی میں فنِ تعمیر سے متعلق ایک کمپنی میں کام بھی کیا ہے۔ اس عمارت میں ویمنس کالج کی طلبا یونین غریب بچوں کے لئے بھی ایک اسکول ''پاپا میاں اسکول'' کے نام سے چلاتی ہے۔ جس میں بعض استانیاں بھی مالی تعاون کرتی ہیں۔

شیخ محمد عبداللہ نے تعلیمِ نسواں کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے 1904ء میں فیمیل ایجوکیشن سوسائٹی بھی قائم کی اور اس سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ملک کے مختلف حصوں میں لیڈیز کانفرنسوں کا بھی انعقاد کیا گیا تا کہ خواتین سے براہِ راست رابطہ قائم کیا جا سکے۔ شیخ عبداللہ صاحب تاحیات اس کے سکریٹری رہے۔ ان کے انتقال کے بعد انسٹیٹیوٹ آف اپتھلما لوجی کی پروفیسر حمیدہ سعید الظفر کو اس کا سکریٹری بنایا گیا۔ حمیدہ سعید الظفر کے بعد الحاج عبیدالرحمٰن خاں شروانی نے سکریٹری کے فرائض انجام دئے۔ گزشتہ آٹھ برسوں سے ویمنز کالج کی سابق پرنسپل پروفیسر ذکیہ اطہر صدیقی اس ذمہ داری کو سنبھال رہی ہیں۔ پروفیسر ذکیہ اطہر صدیقی نے مسلم تعلیمِ نسواں پرڈیوٹی سوسائٹی اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے باہمی اشتراک و تعاون سے کئی کانفرنسوں کا انعقاد بھی کیا۔ ویمنز اسٹڈی سینٹر کا قیام بھی فیمیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ویمنز کالج کی سابق طالبات نے اے ایم یو اولڈ گرلس ایسوسی ایشن بھی قائم کی تھی۔ اس ایسوسی ایشن کا ایک مجلّہ بھی شائع ہوتا ہے اور حامد منزل میں ایک با قاعدہ دفتر بھی قائم ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ وائس چانسلر کی بیگم کی سرپرستی میں ایک لیڈیز کلب بھی قائم ہے۔ اس طرح تعلیم یافتہ خواتین شیخ محمد عبداللہ کے مشن کو جاری و ساری رکھے ہوئے ہیں۔

عبداللہ ہال میں اس وقت لڑکیوں کے ہاسٹلوں کی تعداد سات ہے۔ جس میں وحیدیہ ہاسٹل سب سے پرانا ہے۔ اس ہاسٹل کا سنگِ بنیاد اسکول کے قیام سے پہلے ہی 7رنومبر 1911ء کو یو پی کے قائم مقام گورنر مسٹر پورٹر کی بیگم نے رکھا تھا اور بیگم سلطان جہاں نے 1914ء میں اس عمارت کا افتتاح کیا تھا۔ سب سے قدیم ہاسٹل ہونے کی وجہ سے 2005ء میں اس کی مرمت کا کام وسیع پیمانے پر کرایا گیا۔ اس ہاسٹل سے ملحق 1991ء میں چند نئے کمرے تعمیر کرائے گئے اور اسے نیو وحیدیہ ہاسٹل کا نام دیا گیا۔

مسلم یونیورسٹی کی اولین چانسلر سلطان جہاں بیگم کے نام سے قائم اس ہاسٹل کی بنیاد 1917ء میں رکھی گئی۔ بیگم بھوپال تعلیمِ نسواں کی زبردست حامی تھیں اور شیخ محمد عبداللہ صاحب کو زنانہ اسکول کے قیام کے لئے سب سے پہلے چندہ بھی انہوں نے ہی دیا تھا۔

عظیم مجاہدِ آزادی مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی والدہ ''بی اماں'' کے نام سے اس ہاسٹل کا سنگِ بنیاد 1956ء میں رکھا گیا۔ اس دو منزلہ ہاسٹل میں کل کمروں کی تعداد 51 ہے۔ سامنے ایک خوبصورت لان ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کی صاحبزادی بیگم ممتاز جہاں جو 1937ء سے 1970ء تک ویمنز کالج کی پرنسپل کے فرائض انجام دے چکی تھیں، پاپا میاں اور اعلیٰ بی کی طرح انہوں نے بھی اس ادارے کی توسیع و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی شاندار خدمات کے اعتراف میں 1978ء میں ممتاز جہاں ہاسٹل کی بنیاد رکھی گئی۔ اس ہاسٹل میں تقریباً سو کمرے ہیں۔ یہ ہاسٹل بھی دو منزلہ ہے۔

سر سید احمد خاں کی والدہ مرحومہ عزیز النسائ بیگم کے نام پر 1989ء میں یہ ہاسٹل وجود میں آیا۔ اس ہاسٹل میں دو سو لڑکیوں کے رہنے کا انتظام تھا اس لئے T.W بھی کہا جاتا ہے۔ فنِ تعمیر کے لحاظ سے یہ سب سے خوبصورت ہاسٹل ہے۔ اس کے علاوہ عبداللہ ہال سے ملحق حامد منزل جس میں ایک زمانے تک گرلس ہائی اسکول کی پرنسپل محمودہ انور رہا کرتی تھیں اس کو بھی حامد منزل ہاسٹل میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

1936ء میں ''مسلم گرلس کالج کے مختصر تاریخی حالات اور لڑکیوں اور لڑکوں کی توجہ کے قابل چند مفید خیالات'' کے عنوان سے شیخ محمد عبداللہ فرماتے ہیں کہ ''اس وقت مدرسہ کی ملکیت میں قریب 53 بیگھہ پختہ آراضی ہے۔ جس پر توسیع مدرسہ یونیورسٹی کے درجہ تک ہو سکتی ہے۔'' خدا کرے کہ مسلم ویمنز یونیورسٹی سے متعلق ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو۔

☆☆

حواشی

1۔ ممتاز جہاں حیدرؒ: دیباچہ مشاہدات وتاثرات صفحہ 4
2۔ محمد الدین فوق: تاریخ اقوام پونچھ۔ صفحہ 551 ظفر برادرس تاجرانِ کتب ظفر منزل، لاہور
3۔ شمس الرحمٰن محسنی: حیات عبداللہ۔ صفحہ 19۔ فیمیل ایجوکیشن ایسوسی ایسن، علی گڑھ
4۔ محمد الدین فوق: تاریخ اقوام پونچھ۔ صفحہ 555
5۔ گیل مینول: بیویوں کے مدرسے۔ صفحہ 56، خواتین نمبر، علی گڑھ میگزین
6۔ محمد الدین فوق: تاریخ اقوام پونچھ۔ صفحہ 683
7۔ لبنیٰ کاظم: اے ویمن آف سبسٹینس، زبان حوض خاص انکلیو۔ نئی دلّی 2005ء
8۔ مولوی بشیر احمد قادیانی: مذاہب عالم نمبر 230، سالنامہ گگن 1984ء کامبے کراسٹریٹ۔ بمبئی
9۔ شیخ محمد عبداللہ: مشاہدات وتاثرات صفحہ 280
10۔ سید طفیل احمد منگلوری: محمڈن کالج ڈائرکٹری
11۔ ڈیوڈ لیلیوڈ: علی گڑھ فرسٹ جنریشن، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس
12۔ شمس الرحمٰن محسنی: حیات عبداللہ صفحہ 32۔ فیمیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن، علی گڑھ
13۔ گیل مینول: بیویوں کے مدرسے صفحہ 59 خواتین نمبر
14۔ ڈیوڈ لیلیوڈ: علی گڑھ فرسٹ جنریشن، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس
15۔ گیل مینول: بیویوں کے مدرسے صفحہ 55 خواتین نمبر، علی گڑھ میگزین
16۔ شیخ محمد عبداللہ: مشاہدات وتاثرات صفحہ
17۔ شیخ محمد عبداللہ: سوانح عمری بیگم عبداللہ
18۔ گیل مینول: بیویوں کے مدرسے صفحہ 59۔ خواتین نمبر
19۔ انتخاب مضامین ترتیب۔ م ندیم، محمد قاسم صدیقی

20۔ ماہنامہ راز ترقی: صفحہ 32
21۔ شیخ محمد عبداللہ: مشاہدات و تاثرات
22۔ ایضاً
23۔ گیل مینول: بیویوں کے مدرسے۔ صفحہ 70
24۔ ایضاً صفحہ 77
25۔ فرح نظامی: زنانہ نارمل اسکول سے گرلس کالج تک صفحہ 164 خواتین نمبر، علی گڑھ میگزین 2001ء
26۔ شیخ محمد عبداللہ: مشاہدات و تاثرات صفحہ 243
27۔ فرح نظامی: زنانہ نارمل اسکول سے گرلس کالج تک۔ صفحہ 159۔ خواتین نمبر، علی گڑھ میگزین 2001ء
28۔ شیخ محمد عبداللہ ۔ مشاہدات و تاثرات ۔ صفحہ 149
29۔ لبنیٰ کاظم: اے ویمن آف سبسٹینس
30۔ شمس الرحمٰن محسنی: حیاتِ عبداللہ 223، فیمیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن
31۔ اعجاز احمد: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی: این ایجوکیشنل اینڈ پولیٹیکل ہسٹری 1947-1920ء
32۔ آل احمد سرور: خواب باقی ہیں۔ صفحہ 318 ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
33۔ ڈاکٹر نسیم انصاری: زادِ راہ۔ صفحہ 66 ماہنامہ تہذیب کراچی، دسمبر 2004ء

☆☆

باب چہارم
ہندوستان میں تعلیمِ نسواں کی صورتِ حال

ہندوستان صدیوں سے علم کا مرکز اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ اس ملک کی سب سے بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس نے مختلف مذاہب، زبانوں اور تہذیبوں کو اپنانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ ہندو تہذیب نے اسلام کا استقبال کیا اور اس کے ساتھ بقائے باہمی کے سمجھوتے بھی کئے۔ تاریخِ انسانی کا سب سے بڑا تہذیبی عمل اس سرزمین پنج آب، دوآب اور چہار آب میں اس طرح ہوا کہ اس نے انسانیت کو ایک نیا معنوی رخ دیا، مذہبی، لسانی، فنی تحریکوں کو جنم دیا اور پرانی تحریکوں اور تخیلات کو نئے معنی عطا کئے۔

قدیم ہندوستانی کتابوں میں سرسوتی کو علم کی دیوی سمجھا جاتا ہے اور سرسوتی کی وندنا (عبادت) ہندوستان کی ویدک تہذیب کا حصہ ہے۔

ویدک دور میں عورتوں کا سماجی مرتبہ بہت بلند تھا۔ زندگی کے تمام میدانوں میں انہیں مردوں کی طرح برابری کا حق حاصل تھا مگر لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کو زیادہ اہمیت اور فوقیت حاصل تھی۔ اس کے ساتھ ہی لڑکیوں کی کم عمری میں شادی کا رواج بھی نہیں تھا اور ہندو دلہن کو اپنی پسند کے شوہر کا انتخاب کرنے کی مکمل آزادی تھی۔ (1)

اتھروید میں اس بات کی تعلیم دی جاتی تھی کہ عورت تبھی ایک کامیاب ازدواجی زندگی بسر کر سکتی تھی جب کہ وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی پوری طرح تربیت یافتہ نہ ہو جائے۔ لڑکیوں کو اچھے شوہر کی ترغیب دی جاتی تھی۔ انہیں مقدس کتابوں کا مطالعہ کرنے کی آزادی تھی اور تمام علوم و فنون کے دروازے لڑکیوں کے لئے بھی کھلے ہوئے تھے۔ (2) ویدک دور میں بہت سی

ایسی خواتین کی مثال ملتی ہے جو مذہبی مباحثوں میں حصہ لیتی تھیں اور شاعری بھی کرتی تھیں۔ عورتوں کی تصانیف کے حوالے بھی ملتے ہیں جن میں سے بعض نے رگ وید میں سمت ہاس کے لئے کام کیا۔لڑکیوں کی پیدائش کا خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ (3)

رگ وید کو تصنیف کرنے والوں میں بیس عورتوں کے نام بھی شامل ہیں جن میں لوپا مُدرا، وسوادرا، گھوش کا نام ہندو مذہب میں بہت ہی عقیدت اور احترام سے لیا جاتا ہے۔ تیرمی، پراتھیتئی اور گارگی نے علمی فضیلت کو پروان چڑھانے میں نمایاں خدمات انجام دیں ہیں۔ (4)

اس دور میں جو آشرم ہوا کرتے تھے ان میں مخلوط تعلیم کا نظام تھا۔ بہت سی لڑکیاں معلمی کے پیشہ کو اپناتی تھیں لیکن چوتھی صدی تک لڑکوں کے لئے بھی کوئی باقاعدہ عوامی اسکول نہیں ہوتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم صرف اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے لئے ہی مخصوص تھی۔ عام لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کی اجازت نہیں تھی وہ تعلیم کو صرف اپنے خاندان میں ہی اپنے باپ سے حاصل کرسکتی تھیں یا گھر کی کسی تعلیم یافتہ عورت سے۔ گھر کی چوکھٹ کے باہر انہیں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ پردے کی پابند تھیں۔

ویدک دور کے بعد لڑکیوں میں تعلیم کا چلن بھی ختم ہوگیا اور عورت کو مرد کی ملکیت ہی سمجھا جانے لگا۔ اس کی سماجی اور تہذیبی زندگی بھی کچل کر رکھ دی گئی اور مذہب کو اجارہ داری کے طور پر پروان چڑھایا جانے لگا۔ (5) منوجی نے عورتوں کی آزادی پر پابندی لگادی اور ان کو علم حاصل کرنے کی جو آزادی تھی وہ بھی چھین لی گئی۔

اس برہمنی نظام کے خلاف بودھ مذہب نے خوب ترقی کی اور ایک مرتبہ پھر عورتوں کے ساتھ مساوی سلوک کیا جانے لگا (6) بودھ دھرم کے اس دور میں عورتوں نے تعلیم، ثقافت اور روحانیت میں اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کرلیا۔ (7)

مسز اندرا گاندھی اپنے ایک مضمون ''عورت: دھرم کی دنیا میں'' لکھتی ہیں کہ ہندو دیو مالا میں عورت اور مرد کے لئے ''اردھ ناریشور'' کا لفظ قطعی طور پر موزوں ہے یعنی نصف عورت اور نصف مرد۔ یہ بات اشارہ کرتی ہے شیو اور شکتی کی طرف اور عورت کو ہندو مذہب میں اولیت دی گئی ہے اور یہ بات اکثر مردانہ ناموں سے بھی واضح ہوجاتی ہے۔ جیسے سیتا رام، رادھا کرشن،

گوری شنکر وغیرہ۔

ویدوں میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ ’’بیوی گھر ہے‘‘ بہت سی رکاوٹوں کے باوجود گھر کی منتظم اعلیٰ عورت ہی ہوتی ہے لیکن ہندوستانی سماج میں وہ بہو کے لئے حاکمیت کا ایک واضح رول انجام دیتی ہے اور حاکم بننے سے پہلے ماضی قریب میں اپنا بہو ہونا بھی بھول جاتی ہے۔ شمالی ہند کی عورت دوسری ریاستوں کی عورتوں کی بہ نسبت زیادہ پسماندہ ہے۔ آزادی سے قبل ہندو مرد بیک وقت کئی عورتوں کا شوہر ہو سکتا تھا مگر پہاڑی علاقوں میں ایک عورت کے ایک ہی وقت میں کئی مرد شوہر ہوتے تھے۔ یعنی پہاڑی عورت آج تک مہابھارت کے عہد سے اپنا رشتہ نہیں توڑ سکی۔ مہابھارت کی ہیروئن دروپدی پانچ پانڈوؤں کی ایک بیوی تھی۔ مہابھارت کے زمانے کی چترا شاید وہ پہلی عورت تھی جس نے اپنی آزادی اور اختیارات کو مطالبات کی صورت میں مرد کے سامنے پیش کیا۔

اُپنشد عہد کی گارگی علم و دانش میں اس وقت کے مردوں سے بھی آگے تھی۔ سمراٹ اشوک کی بیٹی سنگھ مترا پہلی مبلغ خاتون تھی جو بدھ کی تعلیمات کی اشاعت کی غرض سے خشکی اور سمندر کا سفر طے کر کے شری لنکا تک گئی۔ جین مت کے چوبیس گرو مانے گئے ہیں۔ ویدیا کی راج کماری ملّی ان میں سے ایک تھی۔ ریاضی داں بھاسکر آچاریہ کی بیٹی لیلاوتی اپنے باپ کو اس کے تحقیقی کاموں میں مدد دیتی تھی۔

مسز اندرا گاندھی مزید کہتی ہیں کہ ’’ہندو قانون ساز منو (Manu) نے عورت کو مرد کا ایک ضمیمہ ہی قرار دیا اور قطعی طور پر عورت کو مرد کا ماتحت ہی ثابت کیا مگر مرد کی قائم کی ہوئی بندشوں کو سب سے پہلے ایک مسلم عورت نے توڑا۔ رضیہ سلطانہ جو پندرھویں صدی میں دہلی کی سلطان بنی اور اس نے پورے طور پر ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ تاریخ میں چتوڑ کی رانی میرا بائی بھی قابل ذکر ہے۔ جس نے کرشن کی تپسونی بن کر اپنے شوہر سے بغاوت کی اور ڈٹ کر اس کی غلط باتوں کا مقابلہ کیا۔ اسی طرح لکشمی دیوی کو بھی ہندوستان کی دانشور خواتین میں شمار کیا جاتا ہے۔ اندور کی رانی اہلیہ بائی جو انتہائی مذہبی خیالات کی مالک تھی اور سنت کے مرتبہ تک پہنچ چکی تھی لیکن جب راج پاٹھ سنبھالا تو اپنے آپ کو ایک لائق اور قابل ایڈمنسٹریٹر ثابت کر دکھایا۔ وہ میدانِ

جنگ میں بھی ایک باہمت جنرل ثابت ہوئی۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی جس کو ہندوستانی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی کہ اس نے انگریزی فوجوں سے ٹکرلی اور وطن عزیز کی آزادی کے لئے بہادری سے جان دے دی'' ۔ (8) رانی جھانسی جس گھوڑے پر سوار تھی اس کے ساتھ ایک دوسری مسلم خاتون بھی جو عرصہ سے اس خاندان سے وابستہ تھی اور ہمیشہ رانی کی مصاحبت میں رہتی تھی، سوار تھی، دونوں کو گولی لگی اور دونوں ہی ساتھ زمین پر گرگئیں۔ (9)

آٹھویں اور نویں صدی میں لڑکیوں کی شادی کی عمر کم کر کے نو سے دس سال تک کردی گئی جو تعلیمِ نسواں کے لئے پاؤں کی زنجیر ثابت ہوئی۔ اس دور میں لڑکیاں اور ان کے والدین تعلیم کے بجائے شادی پر زیادہ زور دینے لگے۔ نویں صدی میں خواتین کے لئے اعلیٰ تعلیم صرف راج گھرانوں تک محدود کردی گئی جس کی وجہ سے دسویں صدی میں مردوں کی خواندگی کی شرح تیس فیصد اور عورتوں کی شرح خواندگی دس فیصد تک رہ گئی حالانکہ اس دور میں مردم شماری کا کوئی باضابطہ ریکارڈ رکھنے کا طریقہ نہیں تھا۔ اس وجہ سے اعداد و شمار کی تصدیق ممکن نہیں۔ (10)

برہمنی نظام کے خلاف نئے سماجی اور مذہبی ریفارمس کے لئے بھکتی تحریک شروع ہوئی تاکہ ہندوستانی سماج میں نئی قدروں کو فروغ دیا جاسکے۔ اس تحریک نے عورتوں کی حالت کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ چھوا چھوت جیسی لعنت کو ختم کرنے پر بھی زور دیا مگر یہ برہمنی نظام عملاً آج بھی ہندوستان میں رائج ہے۔ ہر چند کہ سخت قانون بنادئے گئے ہیں۔

مسلمان جب اس ملک میں داخل ہوئے تو وہ اپنے علمی سرمایہ کو بھی اپنے ساتھ لے کر آئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اشتراک و تعاون سے گنگا جمنی تہذیب کو فروغ حاصل ہوا اور ہندوستان علم کا بہت بڑا خزانہ بن گیا۔ اسلام میں تعلیم پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور علم کے حصول کے لئے مرد اور عورت کے درمیان کسی طرح کا امتیاز نہیں برتا گیا ہے۔

شبانی رائے نے اپنی انگریزی کتاب میں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے حیرانی کا اظہار کیا ہے کہ ''مسلم خواتین ہندو عورتوں کے مقابلے میں زیادہ خوش حال تھیں کیونکہ انہیں خاندانی جائداد میں ملکیت کا حق حاصل تھا اور اگر ان کی طلاق ہوجاتی تو انہیں دوسری شادی کرنے کی اجازت حاصل تھی''۔ (11)

ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت میں سلطان شمس الدین التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ کو ملکۂ ہند کہا گیا۔ یہ خاتون اپنی خداداد قابلیت، حسنِ تدبیر اور زورِ بازو سے ہندوستان کے تخت پر نہایت جاہ و جلال سے جلوہ گر ہوئی۔ تختِ سلطنت پر مردانہ لباس میں بے نقاب بیٹھتی، تمام فرمان اس کے قلم سے جاری ہوتے اور میدانِ جنگ میں اپنی فوج کی سپہ سالار بنتی۔ تین سال چھ ماہ اور چھ روز ہندوستان کی بادشاہ رہی۔ پرانی دلّی کے محلّہ بلبلی خانہ میں دفن ہوئی۔ (12)

ہندوستان کی تاریخ میں دوسرا معتبر نام چاند بی بی کا ہے جس کی جرأت و ہمت کے افسانے ہندوستان کی تاریخ میں قابلِ فخر ہیں۔ اس کی والدہ خدیجہ سلطانہ نے اس کو نہایت اعلیٰ درجے کی تربیت دی اور اس تربیت کا فیض تھا کہ چاند بی بی نے ان تمام کمالات میں کافی دستگاہ بہم پہنچائی جو شاہی خواتین کے لئے باعث زینت ہو سکتے تھے۔ چاند بی بی زبردست شہسوار اور ایک جری دور اندیش سپہ سالار تھی۔ بارہا اپنے شوہر کی زندگی میں اور اس کی وفات کے بعد میدانِ جنگ میں گئی، مختلف زبانوں کی ماہر تھی۔ فارسی، عربی وغیرہ میں دستگاہ وافر رکھتی تھی اور تیلگو، تمل، مراٹھی زبانوں میں بے تکلف گفتگو کرتی تھی۔ علم و فن کی بڑی قدردان تھی اور اپنے حلقے میں ہر فن اور علم کی جاننے والی عورتیں رکھتی تھی۔

مغلیہ دور میں سب سے اہم نام گلبدن بیگم کا ہے جو مغلیہ عہد کے پہلے بادشاہ سلطان ظہیر الدین محمد بابر کی بیٹی تھی۔ بابر کے انتقال کے بعد گلبدن بیگم کا بھائی ہمایوں امورِ سلطنت میں اپنی بہن سے مشورہ کرتا تھا۔ اسے خانہ داری کے کاموں سے جو وقت ملتا تھا اس کو وہ شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں صرف کرتی تھی۔ ہمایوں کے نامور بیٹے جلال الدین محمد اکبر کی فرمائش پر گلبدن نے ہمایوں نامہ لکھا جس کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

جہانگیر کی بیگم نور جہاں کو وہ مرتبہ حاصل ہوا جو مغلیہ سلطنت کی کسی ملکہ کو نصیب نہیں ہوا۔ فرمانِ شاہی پر اس کے دستخط ہوتے تھے۔ سونے اور چاندی کے سکے پر بادشاہ کے نام کے ساتھ اس کا نام کندہ کیا جاتا تھا۔ اپنی ذہانت اور لیاقت کی وجہ سے وہ بادشاہ پر پوری طرح حاوی تھی اور اس کے مشورے کے بغیر بادشاہ کچھ نہ کرتا تھا اور اس کی مرضی ہی قانون کا درجہ رکھتی تھی۔ گلاب کا عطر اس نے ایجاد کیا اور شعر و سخن سے اسے گہری دلچسپی تھی۔ گھوڑے کی سواری میں بھی

اس کو مہارت حاصل تھی۔

مغلیہ سلطنت کی سب سے مشہور خاتون ممتاز محل تھی جس نے اعلیٰ درجہ کی تعلیم بھی پائی تھی۔ نہایت حسین اور صاحبِ جمال تھی۔ اس کا اصلی نام ارجمند بانو تھا۔ شاہ جہاں سے شادی کے بعد اسے ممتاز محل کا خطاب دیا گیا۔ ممتاز محل سے شاہ جہاں کو وہی نسبت تھی جو جہانگیر کو نور جہاں سے تھی۔ ممتاز محل کے انتقال کے بعد جس طرح اس کے شوہر شاہ جہاں نے اس کی یاد میں ایک مقبرہ تعمیر کرایا جس کو تاج محل نام دیا گیا اور ایک شہنشاہ نے حسین تاج محل بنوا کر ساری دنیا کو محبت کی ایک نشانی پیش کی اور آج پوری دنیا کے سات عجوبوں میں اس کا شمار ہوتا ہے اور دنیا کا بچہ بچہ تاج محل کے نام سے واقف ہے۔

شاہ جہاں کی صاحبزادی جہاں آرا بیگم بڑی فاضلہ خاتون تھی۔ اس نے خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے خلفاء پر 26 سال کی عمر میں ایک کتاب بھی تصنیف کی۔ وہ نہایت فیاض بھی تھی۔ عام طور پر غرباء و مساکین اس کی دریا دلی سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ سینکڑوں بیواؤں کی تنخواہیں اس کے یہاں سے مقرر تھیں اور ہزاروں غریب لڑکیوں کی اس نے اپنے خرچ سے شادیاں کرائیں۔ شاہ جہاں کو جب آگرہ کے قلعہ میں قید کر لیا گیا تو وہ اپنے بوڑھے باپ کے وضو کے لئے خود پانی گرم کرتی تھی۔ وہ ایک ممتاز شاعرہ تھی اور خطاطی سے بھی گہری دلچسپی رکھتی تھی۔ اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا کلامِ پاک کا ایک نادر مخطوطہ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی زیب النساءٔ نہایت فاضل اور دانش مند تھی۔ زیب النساءٔ اعلیٰ درجے کے مذاق کی حامل تھی۔ اپنے اوقات کا زیادہ تر حصہ علمی سرگرمیوں میں صرف کرتی تھی۔ اس کے پاس ایک ایسا کتب خانہ بھی تھا جس میں تمام علوم کی کتابیں جمع تھیں۔ وہ اہلِ علم و کمال کی حد درجہ قدردان تھی۔ چنانچہ اس کے ملازمین میں زیادہ تعداد ایسے اشخاص کی تھی جو اس زمانے میں علم و فضل میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ اس کے زمانے میں ایک زیب التفاسیر تیار ہوئی جو اس کے نام سے منسوب ہے۔ یہ ترجمہ قرآن کی مشہور تفسیر کبیر کا ہے جو امام رازی کی نامور تصنیف ہے۔ وہ صاحبِ دیوان شاعرہ تھی۔

خود مغل حکمرانوں نے اپنی بیگمات اور شہزادیوں کو لبرل ایجوکیشن کے مواقع فراہم

کرائے۔ بابر کی بیٹی گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ تصنیف کیا۔ جہانگیر کی اہلیہ نور جہاں، شاہ جہاں کی بیگم ممتاز محل، ان کی بڑی بیٹی جہاں آرا بیگم اور اورنگ زیب کی بیٹی زیب النسأ نے شاہی محلات میں تعلیم حاصل کی۔ (13)

جلال الدین محمد اکبر نے ہندوستانی علوم وفنون کو بہت ترقی دی۔ انہوں نے ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا اور ہندوستان کی اہم کتابوں رامائن، مہابھارت اور گیتا کا فارسی زبان میں ترجمہ بھی کرایا۔ فارسی کے یہ تراجم مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں آج بھی پوری طرح سے محفوظ ہیں۔ اکبر نے فتح پور سیکری میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے الگ سے جگہ بھی مختص کر دی تھی اور کچھ استانیوں کو اس کام کے لئے معمور کیا تھا۔

بادشاہ اورنگ زیب نے اپنے مذہب کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے تعلیم کو بہت فوقیت دی اور تعلیم نسواں کے فروغ میں گہری دلچسپی دکھائی تا کہ ان کے خاندان کی لڑکیاں تعلیم حاصل کر سکیں۔ اورنگ زیب خود بھی اپنی لڑکیوں کو پڑھاتے تھے ۔(14)

مغلیہ عہد میں لڑکیوں کی تعلیم کا چرچا شروع ہو گیا تھا۔ مالدار ہندو اور مسلمان اپنی لڑکیوں کو گھر پر ہی تعلیم دلاتے تھے۔ شمالی ہند میں ہندوؤں کے لئے ''پاٹھ شالائیں'' اور مسلمانوں کے لئے ''مکتب'' قائم کئے گئے جن میں لڑکیوں کو بھی تعلیم دی جاتی تھی۔

ہندوستان کی تاریخ میں سولہویں اور سترھویں صدی کا زمانہ سلطنتِ مغلیہ کے قیام و عروج کا زمانہ تھا۔ اٹھارھویں صدی کا دور مغلوں کے زوال، نادر شاہ کے حملوں اور قتل وغارت گری ولوٹ مار کا دور تھا۔ انیسویں صدی میں انگریزوں کی آمد اور 1857ء کی جنگِ آزادی نے مسلمانوں کی رہی سہی بساط الٹ دی۔ انگریز اپنے ساتھ صرف سامراجی تسلط ہی نہیں بلکہ مغربی تہذیب، طرزِ زندگی اور معاشی بحران بھی لائے۔ ہندوستان کے لئے عام طور سے اور مسلمانوں کے لئے خاص طور پر یہ ایک نیا حادثہ اور تجربہ تھا۔(15)

''ہندوستانی مسلمان'' کے مصنف مسٹر ولیم ہنٹر لکھتے ہیں کہ انگریز قبضے سے پہلے مسلمان نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ ذہن اور فراست کے اعتبار سے بھی ہندوستان میں بہت بڑی قوت رکھتے تھے۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم مسٹر ہیلی کے بقول ''اگر چہ ہمارے (انگریزی) کے نظامِ تعلیم

سے کم تھا، تاہم قابلِ تحقیر نہ تھا۔'' مسلمانوں کے نظام سے اعلیٰ درجے کی ذہنی تربیت دی جا سکتی تھی.... اور یہ نظام ہندوستان کے تمام دیگر تعلیمی نظاموں سے بدرجہا فائق تھا.... انگریزی عملداری کے ابتدائی 75 سالوں میں یعنی 1837ء تک ہم نے اپنے انتظامی عہدہ دار حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کو جاری رہنے دیا اور اس دوران اپنا سر رشتہ تعلیم مکمل کر لیا اور جوں ہی اس سے ایک نسل تیار ہوگئی، ہم نے مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کو اٹھا کر پھینک دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم نوجوانوں پر ملازمت کے دروازے بند ہو گئے۔

جب انگریزی گورنمنٹ نے اپنا سر رشتہ تعلیم جاری کر دیا تھا تو مسلمانوں نے اس میں داخل ہو کر کیوں فائدہ نہ اٹھایا؟ اس کا جواب سر ولیم ہنٹر اس طرح دیتے ہیں:

''اگر ہم اپنے اسکولوں میں انگریز استاد مقرر کرتے یا جرأت کر کے دفتروں کی زبان انگریزی کر دیتے تو ایک اعتبار سے مسلمانوں کی مذہبی مشکلات کم ہو جاتیں، اس لئے کہ عیسائی مذہب خواہ اسلام کے مقابلے میں کسی قدر بھی غیر مکمل کیوں نہ ہو، مسلمان اسے الہامی مذہب ضرور تسلیم کرتے ہیں، لیکن ہندو مذہب کے متعلق ان کا یہ خیال نہیں ہے.... چونکہ اس زمانے میں جنوبی بنگال کے سرکاری اسکولوں کی زبان ہندوؤں کی زبان تھی اور ماسٹر بھی ہندو تھے، اس واسطے اعلیٰ طبقہ کے مسلمان کبھی یہ گوارہ نہ کر سکتے تھے کہ وہ بت پرستوں کی زبان میں تعلیم حاصل کریں۔''

مسٹر ولیم ہنٹر فرماتے ہیں کہ ''ہمارے طریقۂ تعلیم نے ہندوؤں کو صدیوں کی نیند سے جگا دیا اور وہ مردہ سے زندہ ہو گئے لیکن اس نظامِ تعلیم کا مسلمانوں پر الٹا اثر ہوا کیونکہ وہ مسلمانوں کی روایات اور ضروریات کے خلاف تھا۔ چنانچہ 1868ء تک سرکاری اسکولوں کی یہ حالت تھی کہ ان میں دس ہندوؤں کے مقابلے میں صرف ایک مسلم طالب علم ہوتا تھا۔ چونکہ ملازمت کے لئے انگریزی تعلیم شرط تھی، اس واسطے کثرت آبادی کے باوجود 1871ء تک یہ حالت ہوگئی کہ یا تو عدالت، پولس، کلکٹری، فوج میں ہر جگہ مسلمان ہی مسلمان نظر آتے تھے اور اب صوبۂ بنگال کے گزیٹیڈ افسروں میں مسلمانوں کی تعداد صرف تیرہ فیصدی اور انجینیئری اور دفاترِ حسابات میں صرف چار فیصدی رہ گئی۔''

مورخ آر سی مجمدار نے اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کو تاریخ کا تاریک عہد قرار دیا

ہے جبکہ رام راجیہ نے اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان ماضی میں عہدِ زریں تھا۔ دھرم پال مغربی مورخوں کے بیان کردہ تاریخ کے پیچھے چھپے ہوئے حقائق کی بازیافت کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہندوستان اٹھارھویں صدی میں سائنس اور تعلیم میں مغرب سے آگے تھا۔ انہوں نے اعداد و شمار کے ذریعہ ہندوستان میں مغرب سے زیادہ اسکول و مدارس کی تعداد بتائی ہے۔ (16) 1800ء تک بھی یوروپ میں تعلیم عام طریقہ سے نہ پھیلی اور نہ تو ہر ایک کے لئے اس کے دروازے کھلے تھے۔

اٹھارھویں صدی تک مہذب دنیا میں بھی عورتوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت کر دیا جاتا تھا۔ 22 جولائی 1797ء کے ''لندن ٹائمز'' میں لکھا ہے کہ عورتوں کی اہمیت اب کافی بڑھ گئی ہے اور بازار میں اب ان کی قیمت آدھی گنی سے ساڑھے تین گنی ہوگئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اٹھارھویں صدی کے آخر تک انگلینڈ میں عورتوں کے بیچنے کا عام رواج تھا۔ (17)

دلی کی مرکزی حکومت کے روبہ زوال ہونے پر بھی دہلی سے قریب اضلاع روہیل کھنڈ کے مختلف مدارس میں علماً کی تعداد پانچ ہزار تھی (18) ولیم آدم نے بنگال ریاست میں تعلیم پر اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ بنگال اور بہار میں تقریباً ایک کروڑ گاؤں کے اسکول تھے۔ بنگال سروس کا ایک افسر لکھتا ہے کہ ''عزم تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور نسبتاً ہندو ان کے سامنے طفلِ مکتب معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے مسلمانوں میں انتظامی کاموں کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔'' (19)

کلدیپ کور اپنی مشہور کتاب ''ہندوستان میں تعلیم'' میں لکھتی ہیں کہ ''پہلی مرتبہ حکومت نے 03/جون 1814ء میں خاص طور سے ہندوؤں کی تعلیم پر ایک لاکھ روپیہ خرچ کرنے کا اعلان کیا۔'' (20)

1813ء سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانی باشندوں کی تعلیم کی طرف سے بے اعتنائی برتی، البتہ وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) نے 1870ء میں تعلیمی مفاد سے کہیں زیادہ سیاسی مفاد کے پیشِ نظر کلکتہ میں مدرسۂ عالیہ کی بنیاد ڈالی اور جوناتھن ڈنکن (Jonathan

Duncan) نے 1791ء میں بنارس میں سنسکرت کالج قائم کیا۔ (21)

ہندوستانیوں کو مشرقی علوم کی تعلیم دیئے جانے کی حکومت کی تعلیمی پالیسی سے راجہ رام موہن رائے نے اختلاف کیا۔ 1824ء میں کلکتہ میں سنسکرت کالج کھولنے کی تجویز پر انہوں نے موجودہ دور کے پیشِ نظر سنسکرت کی تعلیم کو ناکافی بتایا۔ (22) 11 / دسمبر 1830ء کو راجہ رام موہن رائے نے گورنر جنرل کو ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں انہوں نے نئے علوم کی اشاعت کی طرف گورنمنٹ کی توجہ مبذول کرائی۔ اس کے برعکس 1839ء میں جب مسلمانوں کو پتہ چلا کہ سرکاری اسکولوں میں انگریزی تعلیم کا بندوبست ہوگا تو مسلمانوں نے آٹھ ہزار مولویوں کے دستخط بھیج کر انگریزی تعلیم کی مخالفت کی۔ (23)

ہندوستان میں انگریزی نظامِ تعلیم کے تحت لڑکیوں کا پہلا اسکول 1811ء میں ولیم کیری، مارش مین اور وارڈ نے کلکتہ میں قائم کیا جس میں چالیس لڑکیوں کو داخل کیا گیا۔ یہ سبھی لڑکیاں ہندو فرقہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ لڑکیوں کا دوسرا اسکول 1818ء میں لندن مشنری سوسائٹی کی روبرٹ مے نے قائم کیا۔ 1819ء میں فیمیل جیوینائل سوسائٹی کی طرف سے لڑکیوں کا تیسرا اسکول قائم کیا گیا۔ ان اسکولوں کے قیام کے بعد سے کئی انگریز خواتین تعلیم نسواں کو فروغ دینے کے لئے ہندوستان آئیں۔ ان میں سے بعض کے نام میری این کوک، میری کارپینٹر، صفیہ ڈوبسن، اینیٹ اکیڈائٹ تھا۔ (24)

ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز بنگال سے ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ بنگالی متفکر سماج نے بھی اس میدان میں پیش قدمی کی۔ بنگال کی ہی سرزمین سے راجہ رام موہن رائے قوم کی اصلاح کا پرچم لے کر اٹھے اور اپنی قوم کے اندر تعلیمی و تہذیبی شعور بیدار کیا۔ بنگال کے مسلمانوں میں بھی بیداری کے آثار رونما تھے۔

راجہ رام موہن رائے اور ایشور چند ودیا ساگر نے محسوس کیا کہ فلاح اور اصلاح کی تمام کوششیں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتیں جب تک کہ خواتین تعلیم یافتہ نہ ہوں۔ ان کا مقصد سماج میں بہتری کے لئے تبدیلی لانا تھا۔ ودیا ساگر نے ہندو بیواؤں کی دوسری شادی سے پابندی ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ اکتوبر 1855ء میں انہوں نے اس وقت کی سرکار کو اس جانب متوجہ کیا کہ

ہندو بیواؤں کو دوبارہ شادی کی اجازت دی جائے اور ایک سال کے عرصے میں ان کے مطالبہ کو حکومت نے تسلیم کر لیا۔

انہوں نے سرکار سے ایک بار پھر رجوع کیا کہ کم عمری کی شادیوں پر بھی پابندی عائد کی جائے لیکن اسی دوران 10 رمئی 1857ء کو فوجیوں نے بغاوت کردی اور حالات میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے محسوس کیا کہ محض قانون بنانے سے اس مسئلہ کا حل ممکن نہیں ہے اور تعلیم نسواں کے اسکول قائم کرنے سے ہی لڑکیوں کو بیدار کیا جاسکتا ہے اور کم عمری کی شادی تبھی روکی جاسکتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں جے ای ڈرنک واٹر بیتھون (J.E.Drinkwater Bethune) جو گورنر جنرل کی کونسل کے رکن، بنگال کی کونسل آف ایجوکیشن کے صدر تھے، ان کے تعاون سے 1849ء میں بیتھون اسکول قائم کیا گیا جس میں اکیس لڑکیوں کو داخل کیا گیا مگر بدقسمتی سے اس میں ایک بھی مسلم لڑکی نہیں تھی۔ یہی اسکول ترقی کے منازل طے کر کے کلکتہ میں پہلا اعلیٰ تعلیم کا کالج بنا (25)

نومبر 1857ء سے جون 1858ء تک ایشور چند ودیا ساگر نے تقریباً 35 لڑکیوں کے اسکول وردھ مان، ہگلی، مدنا پور اور نادیا علاقوں میں قائم کیے۔ تعلیمِ نسواں کے یہ اسکول ترقی کرتے کرتے کالج میں تبدیل ہوگئے اور چندر مکھی باسو اور کامنی باسو نے گریجویشن کی ڈگری حاصل کر لی۔ (26) اس طرح بنگال میں راجہ رام موہن رائے، ایشور چند ودیا ساگر، اکشے کمار دتا، بی بی طاہرہ نساں، فوز النساں چودھرانی، کریم النساء خانم، بیگم رقیہ سخاوت حسین نے بنگال میں تعلیم نسواں کے تعلق سے ایک انقلاب برپا کر دیا۔

1857ء میں ہی کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم ہوگئیں مگر عورتوں کو ان یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ سب سے پہلے کلکتہ یونیورسٹی میں 1877ء میں خواتین امیدواران کو امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔ (27)

خواتین کو پیشہ ورانہ تربیت کی اہمیت کا احساس پہلی مرتبہ 1860ء میں ہوا۔ کولونیل گورنمنٹ نے استانیوں کی ٹریننگ کے لئے ایک بھی اسکول قائم نہیں کیا۔ حالانکہ عیسائی مشنریز اور بعض لوگ انفرادی طور پر اس کام کے لئے کوشاں بھی رہے۔ (28) ممتاز انگریز سماجی کارکن

مس میری کارپینٹر جب ہندوستان میں تعلیمِ نسواں کی غرض سے آئیں تو انہوں نے لڑکیوں کے لئے ٹیچرس ٹریننگ کالج کو ضروری سمجھا اور انہوں نے اس ضمن میں ہندوستان کے اعلیٰ حکام سے بات چیت کی اور انہیں کی کوششوں سے ہندوستان میں پہلا ٹیچرس ٹریننگ اسکول 1870ء میں قائم ہوا تاکہ پرائمری سطح کی استانیوں کو تیار کیا جا سکے۔ 1882ء تک ہندوستان میں خواتین استانیوں کے ٹیچرس ٹریننگ کالجوں کی تعداد پندرہ تک ہو گئی۔ (29)

انگریزوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد شروع میں تعلیمِ نسواں کی تعداد میں اضافہ ہونے کے بجائے کمی واقع ہوئی۔ ہندو اور مسلمانوں کو ان مشنری اسکولوں کے بارے میں بہت سے شک وشبہات تھے اور خاص طور سے مشرقی تصورات کے حامل طبقے کے شکوک وشبہات کو عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں سے بھی تقویت پہنچی۔ یہ مشنریاں ملک کے گوشے گوشے میں عیسائیت کی تبلیغ کر رہی تھیں اور ان کو حکومتِ برطانیہ کا پورا تعاون حاصل تھا۔ ان کا نقطۂ نظر محض سیاسی نہ تھا بلکہ مذہبی بھی تھا۔ ہندوستان میں اپنی تعلیم عام کر کے عیسائیت پھیلانا بھی ان کے مقاصد میں شامل تھا۔ ان کا تو یہاں تک کہنا تھا کہ ''اگر براعظم کے اس وسیع علاقے کو مسیح کر کے فتح نہ کیا گیا تو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کا سارا مقصد ختم ہو جائے گا۔'' (30)

عیسائیت کی تبلیغ کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوؤں کے کئی معزز افراد اپنے مذہب کو چھوڑ کر عیسائی مذہب اختیار کر چکے تھے۔ مشہور شاعر مدھوسودن دت، ممتاز صحافی اور دلی کالج کے استاد ماسٹر رام چندر، کرشن موہن وغیرہ عیسائی ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کو یہ خطرہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ ہندوستان کے باشندوں کو عیسائی مذہب قبول کرنے کے لئے حکومت کوئی جبریا قدم اٹھائے۔

انگریزی اسکولوں میں جو تعلیم دی جا رہی تھی اس کا بھی یہی مقصد تھا کہ عیسائی مذہب کی ترویج واشاعت ہو۔ ہندو کالجوں کے سربراہوں کو جب یہ خطرہ درپیش ہوا کہ ہندو طالب علموں پر اس ترویج واشاعت کا کہیں اثر نہ پڑے تو انہوں نے یہ حکم نامہ جاری کر دیا کہ جو طالب علم عیسائیوں کے خطبوں اور مناظروں میں شرکت کرے گا اس کا نام کالج سے خارج کر دیا جائے گا۔ ہندوؤں نے ''تتد بودھنی'' نام کا ایک اخبار نکالا جس میں سماجی ومذہبی اصلاح کے لئے مضامین لکھے جاتے تھے لیکن عیسائی مشنریوں کی تبلیغی کوششوں میں کمی نہ آئی۔ میکالے نے نہایت وثوق

کے ساتھ کہا تھا کہ ''میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم سے متعلق ہماری تجاویز عمل در آمد ہوئیں تو بیس سال بعد بنگال میں ایک بت پرست بھی باقی نہ رہے گا۔'' (31)

لہٰذا علماٗ نے برطانوی تسلط کو اسلام کے حق میں مستقل خطرہ محسوس کیا۔ 1830ء میں لندن مشنری سوسائٹی کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ اسکولوں میں مذہبی تعلیم نہ بھی ہو تب بھی انگریزی تعلیم سے خود بخود عیسائیت پھیلے گی۔ آئے دن پڑنے والے قحط میں یتیم اور لاوارث، ہندو اور مسلمان بچوں کو عیسائی مشنریاں اپنے ڈھنگ سے تعلیم و تربیت دیتیں اور انہیں عیسائی بنانے میں ہر ممکن کوشش کرتیں۔ کسی بھی دور میں جب کبھی مذہبی انحطاط کی صورت نظر آئی تو علمائے دین مذہبی اقدار کی مدافعت کے لئے حتی الامکان کوشش کرتے نظر آئے ہیں۔ (32)

ہندوستانیوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے ان خطرات و شبہات کے بارے میں سر سید اسباب بغاوتِ ہند میں لکھتے ہیں کہ ''پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں کو اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور تکلیف پہنچتی تھی۔'' (33)

''امتحانات کے سوالات میں بچوں سے پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون ہے؟ تمہارا نجات دہندہ کون ہے؟ اگر عیسائی مذہب کے مطابق جواب ملتا تو ان بچوں کو انعامات دئے جاتے تھے۔'' پادری ایڈمنڈ نے سب کو ایک ہی مذہب اختیار کرنے کے سلسلے میں سرکاری کارکنوں کو غور کرنے کے لئے جو خط لکھا تھا اس کے بارے میں سر سید لکھتے ہیں کہ ''ان چھٹیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ سب کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت آ گیا۔ اب جتنے سرکاری نوکر ہیں اول ان کو کرسٹان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو۔'' (34)

سر سید کے معاصر اور طنز و مزاح کے مشہور شاعر اکبر الہ آبادی نے انگریزی نظامِ تعلیم پر اپنی شاعری میں اس طرح طنز کیا ہے ؎

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

یہی وہ وجوہات اور خطرات تھے جن کی وجہ سے عیسائی مشنریوں کے قائم کردہ اسکولوں میں بچوں کو تعلیم دلانے سے ہندو اور مسلمان دونوں برا سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے انیسویں صدی کے شروع میں تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کی تعداد میں کمی واقع ہوگئی۔ منرو (Munro) نے مدراس میں 1822ء میں اسکول میں تعلیم حاصل کرنے والے لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے کہا کہ ایک لاکھ 78 ہزار لڑکوں کے مقابلے میں صرف پانچ ہزار 480 لڑکیاں ابتدائی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔

1824ء سے 1829ء تک بمبئی کے کسی بھی اسکول میں ایک بھی لڑکی تعلیم حاصل نہیں کر رہی تھی۔ البتہ بعض خوش حال اور ترقی یافتہ گھرانوں کی لڑکیاں اپنے گھروں میں کچھ تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ (35)

برٹش حکمراں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے رسماً کوششیں کر رہے تھے کیونکہ ان کا اصل مقصد تو سیاسی اور اقتصادی تھا۔ صرف مشنریز اور بعض رضا کارانہ تنظیمیں جس میں عیسائیوں کی اور ہندوستانیوں کی تھیں وہ ضرور تعلیمِ نسواں کے لئے سرگرم عمل تھیں۔ انہوں نے ہندوستان میں تعلیمِ نسواں کے فروغ کے لئے گہری دلچسپی دکھائی تھی۔ انہوں نے ہندوستان کے مختلف گوشوں میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے اسکول اور کالج کے قیام کے لئے اپنے پاس سے رقومات بھی خرچ کی تھیں۔ (36)

1820ء میں ڈیوڈ ہیرے (David Hare) نے کلکتہ میں لڑکیوں کا ایک اسکول اپنے پیسہ سے قائم کیا۔ پروفیسر پیٹن (Patton) نے ایلفنسٹن (Elphinstone) کالج 1848ء میں ممبئی میں قائم کیا۔ (37) وہ پہلا شخص تھا جس نے مذہب اور تعلیم کو ملانے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔

لارڈ ڈلہوزی جب ہندوستان کے گورنر جنرل مقرر کئے گئے تو انہوں نے برٹش تعلیمی پالیسی میں ایک خوش آئند تبدیلی کی (38) انہوں نے واضح طور پر اعلان کیا کہ ہندوستانیوں کی رسم و رواج میں کسی بھی طرح کی تبدیلی نہیں کی جائے گی اور جو لوگ بھی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ادارے قائم کرنا چاہتے ہیں انہیں حکومت کی طرف سے فیاضانہ امداد فراہم کرائی جائے گی۔ ان

احکامات کو 1854ء میں منظوری حاصل ہوگئی۔(39)

تعلیمی گشتی کے مطابق مدراس میں 256 لڑکیوں کے اسکولوں میں ان کا اندراج تقریباً آٹھ ہزار تھا۔ بمبئی میں 65 گرلس اسکولوں میں ان کی تعداد چھ ہزار پانچ سو تھی۔ بنگال میں 288 اسکول لڑکیوں کے پائے گئے جس میں ان کی تعداد 6 ہزار 869 تھی۔ شمالی مغربی ریاستوں میں بشمول اودھ لڑکیوں کے صرف سترہ اسکول تھے جس میں 386 لڑکیاں زیرِ تعلیم تھیں۔ یہ تمام ادارے مشنریوں کے ذریعہ چلائے جا رہے تھے۔(40) اس سے پتہ چلتا ہے کہ برٹش طاقت کے اس وقت ہندوستان میں تین اہم مراکز بمبئی، کلکتہ اور مدراس تھے۔

ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ دہلی، لکھنؤ اور اس کے اطراف و جوانب میں انگریزی مشنریوں کی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس پورے علاقے میں جاگیردارانہ ذہنیت کا خاصہ عمل دخل تھا، تہذیبی پسماندگی کی اصل وجہ فضول رسم و رواج کی پابندی تھی اور فضول رسم و رواج کے چلن کا سبب تعلیم کی کمی تھی جبکہ مدراس، بمبئی اور بنگال کے علاقوں میں ہندو اور مسلمان دونوں بہت پہلے سے مغربی تہذیب سے متاثر ہو رہے تھے اور ان میں رفتہ رفتہ بیداری آ رہی تھی۔(41)

ہندوستان میں تعلیم نسواں کے مسائل کا جائزہ لینے اور اس میں اصلاح کے اقدامات کرنے کے لئے 1882ء میں ولیم ہنٹر کی سربراہی میں انڈین ایجوکیشن کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔ اس کمیشن نے سفارش کی کہ لڑکیوں کے لئے گرانٹ دینے میں فراخ دلی برتی جائے، لڑکیوں کو اسکالرشپ جاری کئے جائیں اور لڑکیوں کے لئے ہاسٹل تعمیر کرائے جائیں۔ بدقسمتی سے اپنی مالی بدحالی کی وجہ سے گورنمنٹ نے مطلوبہ رقم مہیا نہیں کرائی۔ اس وقت تک ہندوستان کے دیہی علاقے میں لڑکیوں کا کوئی اسکول نہیں تھا۔ (42)

لڑکیوں کے لئے کالج کی تعلیم بھی بہت محدود تھی اور کچھ ترقی یافتہ سماج کی 169 طالبات ہی 02-1901ء تک کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں جن میں 102 یوروپین اور اینگلو انڈین، 32 ہندوستانی عیسائی اور سولہ پارسی تھیں۔ ہندو اور مسلمانوں میں تعلیم نسواں صرف پرائمری سطح تک ہی محدود تھی۔ 1901ء کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ایک ہزار میں سے صرف

دس ہندو اور چار مسلم لڑکیاں ہی انگریزی تعلیم میں خواندہ تھیں۔ (43)

اس عرصہ میں جو اچھی بات ہوئی وہ یہ تھی کہ لڑکیوں کو گھر کی چہار دیواری سے باہر اپنا کیریئر چننے کے دروازے کھلے۔ پہلا کیریئر لڑکیوں کو معلّمی کا پیشہ اختیار کرنے کا تھا دوسرا کیریئر میڈیسن تھا اور بہت سی خواتین نے نرسنگ اور مڈوائفس کی ٹریننگ حاصل کی۔ ایک اہم واقعہ لیڈی ڈفرن کی جانب سے ایک فنڈ کا قیام تھا جس کا مقصد ہندوستان میں میڈیکل ایجوکیشن کا فروغ تھا۔

اواخر انیسویں صدی میں بائیسکل سوار عورت انگلستان اور امریکہ میں آزادیٔ نسواں کی علامت بنی۔ وہ بطور ''ٹائپ رائٹر'' دفتروں میں کام کرنے لگی تھی۔ ٹائپسٹ کو اس زمانے میں ٹائپ رائٹر کہا جاتا تھا...... عورتوں کا سائیکل چلانا ایک انقلابی قدم تھا۔ خواہ وہ پردہ دار باغی میں دو چرخی چلائیں۔ بائیسکل چلانے والی لڑکیاں گویا نئی عورت کی نمائندگی کررہی تھیں۔ یلدرم کا افسانہ ''صحبت ناجنس'' جو 1905ء میں لکھا گیا۔ اس میں دو لڑکیوں کی خط و کتابت پیش کی گئی ہے..... وہ آزادیٔ نسواں، عورتوں کے مساوی حقوق کے زبردست علمبردار تھے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ناقدین ان کو محض ایک ایسے ادیب کے طور پر پیش کرتے ہیں جس کے یہاں عورت رومان کا سمبل تھی۔ اپنے افسانے ''ازدواجی محبت'' (1907ء) میں ہی انہوں نے عورتوں کی یونیورسٹی قائم کرنے کے خواب دیکھے تھے۔ (44)

تعلیم نسواں کی اس ملک گیر تحریک کے اثرات ہندوستانی مسلمانوں پر بھی نمایاں ہونے لگے۔ صنعتی انقلاب اور انیسویں صدی کی سائنسی پیش رفت نے رفتہ رفتہ مسلمانوں کے دلوں سے بھی جنسی تعصب کو ختم کرنے کی پہل شروع ہوگئی۔ سالار جنگ نے سب سے پہلا اسکول ''دارالعلوم'' قائم کیا جس کا مقصد ثقافت کا فروغ تھا۔ (45)

سالار جنگ نے حیدرآباد اور علی گڑھ کالج کے درمیان آپسی شراکت کا آغاز کیا اور حیدرآباد ریاست نے علی گڑھ کالج کے بجٹ میں بھی تعاون دیا اور علی گڑھ کے طلبائے قدیم کو بھی ملازمتوں کے بہترین مواقع فراہم کئے۔ (46) سروجنی نائیڈو کے والد ڈاکٹر اگورناتھ چٹوپادھیائے نے نظام کالج قائم کیا۔

1870ء میں ہندو مصلح تحریک برہمو سماج نے لڑکیوں کا سب سے پہلا اسکول قائم کیا اور 1890ء میں حیدرآباد میں لڑکیوں کا پہلا اسکول شروع ہوا۔ علی گڑھ کالج کا نصف ثانی علی گڑھ زنانہ مدرسہ شیخ محمد عبداللہ اور ان کی اہلیہ نے 1906ء میں قائم کیا۔ رقیہ سخاوت حسین نے 1911ء میں کلکتہ میں سخاوت میموریل گرلس اسکول قائم کیا۔ کرامت حسین کالج کا قیام 1912ء میں لکھنؤ میں عمل میں آیا جبکہ حیدرآباد میں لڑکیوں کا اردو میڈیم اسکول دو دھائی پہلے ہی قائم کر دیا گیا تھا۔

اگورناتھ چٹوپادھیائے نے 1881ء میں ہندو اینگلو ورنا کولر اسکول لڑکیوں کے لئے قائم کیا جس میں ہندو اور مسلمانوں کی 76 طالبات داخل تھیں۔ (47) ایک مضمون مورخہ 1897ء میں درج ہے کہ مدرسہ عزیزہ نسواں گذشتہ آٹھ اور نو سال سے ریاست کی امداد سے چلتا تھا جس میں عزت دار طبقہ کی بیٹیاں اس میں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ اس میں عماد الملک سید حسین بلگرامی کی بیٹی طیبہ نے بھی تعلیم حاصل کی جو بعد میں ہندوستان کی پہلی مسلم گریجویٹ قرار پائیں (48)

اس مضمون سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک اور اسکول جسے مدرسۂ نسواں کہا جاتا تھا اور ریاست کے خزانے سے چلتا تھا اس کو سالار جنگ کی بڑی بیٹی نور النسأ بیگم نے قائم کیا تھا۔ ان کی تعلیم سے رغبت ان کے والد کی وجہ سے تھی اور انہوں نے اپنے والد سے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ حیدرآباد کی پہلی ایسی خاتون تھیں جنھوں نے فرینچ کے علاوہ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ہندوستان میں سب سے پہلے طیبہ بیگم نے انجمن خواتین اسلام کی بنیاد ڈالی اور صغرا ہمایوں مرزا اس کی جنرل سکریٹری مقرر ہوئیں۔

اسی سال حیدرآباد میں ایک زنانہ اسکول بھی موجود تھا جس میں مڈل کلاس تک انگریزی، عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم کا انتظام تھا۔ اس اسکول میں 32 لڑکیوں کو چار کلاسوں تک کی تعلیم تین یوروپین اور دو ہندوستانی خواتین دیتی تھیں۔ اس زنانہ اسکول میں پردے کا خاص انتظام تھا اور شریف گھرانوں کی لڑکیاں ہی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔

انگریزی تعلیم کی شروعات نام پلّی اسکول میں 1890ء سے ہوئی اور 1907ء میں نیا زنانہ اسکول قائم کیا گیا جس کا نام تبدیل کر کے محبوبیہ گرلس اسکول 1910ء میں ہوا۔

خواتین دکن کی اردو خدمات پر 1940ء میں ایک کتاب شائع ہوئی۔ نصیر الدین ہاشمی

نے 1880ء سے 1940ء تک کی 150 خواتین شاعرات کی سوانح درج کی ہیں۔ ڈاکٹر نصیرالدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ اردو کی پہلی صاحبِ تصنیف شاعرہ لطف النسأ امتیاز تھیں۔ (49) جبکہ اردو کے زیادہ تر تذکرہ نگاروں نے چندہ ماہ لقأ کو اردو کی اولین صاحبِ تصنیف شاعرہ قرار دیا ہے۔ (50)

مسلم خواتین کے شعور کو بیدار کرنے اور انہیں عصرِ حاضر کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اردو صحافت نے بھی کلیدی رول ادا کیا ہے۔ گیل مینول (Gail Minaul) لاہور کے ممتاز حسین کے رسالے تہذیب النسواں کو خواتین کا پہلا اردو رسالہ قرار دیتی ہیں (51) جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حیدرآباد کے محبّ حسین نے 1886ء میں خواتین کا پہلا اردو رسالہ ''معلم نسواں'' شائع کیا جس میں نظمیں، ڈرامے، کہانیاں، خبریں شامل ہوتی تھیں اور دنیا کی عورتوں کی سرگرمیوں کو نمایاں طور پر شائع کیا جاتا تھا۔ خواتین کی نئی سرگرمیوں کو بڑھاوا دیا جاتا تھا جیسے لڑکیوں کے اسکول، زچگی اسپتال کا قیام، قانون کی تعلیم میں خواتین کے داخلے۔ جس میں خاتون وکیل آزادانہ طور پر پردے میں عورتوں کو ان کے حقوق کا تحفظ کرنے کی تعلیم دیتی تھیں۔ رسالے کے شماروں میں مولوی مریم بیگم صاحبہ کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ معلم نسواں کے مدیر محبّ حسین نے عورتوں کے لباس پر بھی مضامین لکھے۔ اکبری بیگم نے اپنے ایک ناول میں جو 1898ء میں شائع ہوا۔ لکھنؤ کی ایک نواب زادی کو ایک مثالی استانی سے ریاضی اور کیمسٹری کا سبق لیتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم سماج کی عورتیں کتنی روشن خیال تھیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان کی پہلی مسلم گریجویٹ طیبہ بیگم (1873-1921ء) نے مسلم خواتین کے لئے اعلیٰ تعلیم کی بھی حوصلہ افزائی کی اور شادی کے بعد بھی ان کے شوہر خدیو جنگ نے بھی بھرپور تعاون کیا۔ ان کی بیٹیاں معصومہ اور سکینہ پہلی لڑکیاں تھیں جو محبوبیہ اسکول میں داخل ہوئیں اور انہوں نے اس اسکول کے قیام اور اس کی ترقی میں گہری دلچسپی دکھائی۔ حیدرآباد میں صدی کے شروعات میں جتنی بھی خواتین کی فلاح و بہبودی کی تنظیمیں قائم ہوئیں وہ ان کی محرک خاص تھیں اور حیدرآباد و شمالی ہند کی خواتین کے اجلاس میں وہ برابر شریک ہوئیں اور خواتین سے سیدھے طور پر اپنی تقاریر میں مخاطب ہوتی تھیں۔

طیبہ بیگم جہالت کی ملامت کرتی تھیں اور خواتین کے لئے بھی علم کو اتنا ہی ضروری سمجھتی تھیں جتنا کہ مردوں کے لئے۔ وہ کہتی تھیں کہ "قرآن و حدیث میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی ہے۔" طیبہ کہتی تھیں کہ "خواتین کو محض دینی تعلیم تک ہی محدود نہ رکھا جائے اور برطانیہ کی خواتین کی طرز پر ان کو بھی گھر کو بہتر چلانے کے طور طریقوں کے بارے میں تعلیم دلائی جائے تا کہ ان کی دنیاوی معلومات میں اضافہ ہو سکے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کی خوشی اور غمی کو سمجھ سکیں اور شوہر اور بیوی ایک دوست کی طرح اپنی زندگی گذار سکیں۔"

حیدر آباد کی ایک دوسری خاتون صغرا ہمایوں بیگم کی پیدائش 1884ء میں شمالی ہندوستان کے ایک ڈاکٹر کے یہاں ہوئی جو حیدر آباد منتقل ہو گئے۔ ان کی شادی سولہ برس کی عمر میں ہمایوں مرزا ایڈوکیٹ سے ہوئی جو عورتوں کے اولین رسالے کے مدیر محبّ حسین کے دوست اور ان کے قانونی مشیر تھے۔ صغرا بیگم کبھی اسکول نہیں گئیں اور اپنے گھر پر ہی اپنی ماں کی طرح استانیوں سے تعلیم حاصل کی۔ ان کے شوہر ان کی خوبصورتی اور دولتِ تعلیم سے کافی متاثر تھے۔ انہوں نے نہ صرف انہیں امور خانہ داری میں سدھار کی اجازت دی بلکہ مکمل رہائشی عادات کو بہتر بنانے کی اجازت دی۔ (52) وہ مختلف اخبارات و رسائل میں مضمون بھی لکھتی تھیں اور انہوں نے اپنا ایک جریدہ "النسواں" جو بعد میں "زیب النسأ" ہو گیا جب وہ 1934ء میں لاہور منتقل ہو گئیں۔ حالانکہ انہوں نے چودھا ضخیم ناول بھی لکھے۔ جن میں سے سرگذشتِ حاجرہ، ظہرہ، انوری بیگم خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ صغرا ہمایوں مرزا کے ناول "موہنی" کے چار ایڈیشن شائع ہوئے۔ عورتوں کی طلاق کے مسائل، بیواؤں کی دوبارہ شادی اور خواتین کی اپنی پسند کی شادی کے حق کے سلسلے سے متعلق اس سماجی ماحول کے لحاظ سے ایک بے باک تجزیہ ہے۔ (53)

بھوپال کی والئ ریاست نواب سکندر بیگم مردوں کی طرح فنون سپہ گری اور شہہ سواری میں ماہر تھیں۔ گھوڑوں اور ہاتھیوں پر بیٹھ کر بے پردہ دورے کرتی تھیں۔ فارسی کی نہایت اعلیٰ درجے کی لیاقت رکھتی تھیں۔ ریاست بھوپال میں رعایا کی تعلیم کے لئے اردو اور ہندی کے مدرسے قائم کئے۔ 1870ء میں خاص شہر میں مدرسہ سلیمانیہ اپنی چھوٹی نواسی سلیمان جہاں بیگم کے نام سے عربی، فارسی، اردو، ہندی اور انگریزی کی تعلیم کے لئے کھولا۔ دستکاری اور صنعت و

حرفت کے سکھانے کے واسطے ملکۂ وکٹوریہ کے نام سے وکٹوریہ مدرسہ قائم کیا۔

دلی کی جامع مسجد، جو 1857ء کے غدر کے بعد اس جرم پر بند کردی گئی تھی کہ مسلمانوں نے بھی اس میں حصہ لیا تھا، بیگم صاحبہ کی استدعا پر کھل گئی اور عام طور پر مسلمانوں کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت ملی (54) انہیں اسٹار آف انڈیا کے خطاب سے بھی نوازا گیا تھا۔ نواب بیگم سکندر کی صاحبزادی شاہ جہاں بیگم بھی سات آٹھ سال کی عمر میں بھوپال کی رئیسہ ہوئیں۔ انہوں نے اردو، فارسی، حساب وغیرہ میں اچھی لیاقت حاصل کی۔ اس کے علاوہ فنون سپہ گری مثلاً شہہ سواری، نیزہ بازی وغیرہ میں بھی مہارت پیدا کی۔ انہوں نے طبی امور پر بھی بہت زیادہ توجہ کی۔ بھوپال میں یونانی شفاخانے اور پرنس آف ویلز ہاسپٹل قائم کیا اور عورتوں کے علاج کا خصوصی انتظام کیا۔ چھوٹے بچوں کو مختلف بیماریوں سے بچانے کے لئے ٹیکے لگوانے پر خاص دھیان دیا۔ انگریزی تعلیم کے لئے ایک ہائی اسکول قائم کیا اور ایک بہت بڑا مدرسہ جہانگیریہ اپنے والدِ مرحوم جہانگیر محمد خاں کے نام سے شروع کیا جس میں سینکڑوں طلبا کو تعلیمی وظیفے دیئے جاتے تھے۔ اپنے مرحوم شوہر نواب صدیق الحسن خاں مرحوم کے مزار پر بھی ایک مدرسہ قائم کیا اور ایک صنعت و حرفت کا اسکول بھی کھولا جس میں دری، قالین بنانے کے علاوہ سلائی کڑھائی سکھائی جاتی تھی۔

انہوں نے اپنے نام سے ایک شاہ جہانی پریس قائم کیا جہاں سے ایک ہفتہ وار اخبار ''عمدۃ الاخبار'' کے نام سے جاری کیا اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔ انہوں نے عورتوں کی ضروریات کے لئے ایک کتاب ''تہذیب نسواں و تربیت النساں'' لکھی۔ انہوں نے بھوپال کی تاریخ بھی لکھی جو فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوئی۔ وہ شاعری بھی کرتی تھیں اور شیریں تخلص تھا۔

نواب شاہ جہاں بیگم کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم بھوپال کی تیسری ایسی خاتون تھیں جنہوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ وہ 9/ جولائی 1858ء کو پیدا ہوئیں۔ پانچ سال کی عمر میں ان کی تعلیم شروع ہوئی۔ کلام مجید، تفسیر، خوش خطی، فارسی، انگریزی اور پشتو جیسی زبانیں بھی سکھائی گئیں۔ اس کے علاوہ آبائی فنونِ سپہ گری بھی سکھائی گئی۔ انہیں مصوری سے خاص دلچسپی تھی۔ ان کی شادی جلال آباد کے نوجوان نواب احمد علی خاں سے ہوئی جن سے دو بیٹیاں اور تین

بیٹے پیدا ہوئے۔ان کے بیٹے نواب نصر اللہ خاں کے نام پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وقار الملک ہال میں ایک ہاسٹل بھی ہے جو نواب سلطان جہاں بیگم کے عطیہ سے قائم ہوا تھا۔خود علی گڑھ میں تعلیم نسواں کو فروغ دینے میں انہوں نے سب سے پہلے پیش کش کی اور ان کے نام پر عبداللہ ہال کا سلطانیہ ہاسٹل ہے۔چونکہ وہ خود تعلیم یافتہ تھیں اس لئے تعلیم کے لئے زندگی بھر کوشاں رہیں۔ ریاست بھوپال میں اپنی ریاست کے ملازمین کے بچوں کی تعلیم کے لئے الیگزینڈر رہائی اسکول کھولا۔ مسلمان لڑکیوں کے لئے 1321 ہجری میں مدرسہ سلطانیہ اور ہندو لڑکیوں کے لئے برجیسیہ کنیا پاٹھ شالا قائم کی۔

عورتوں کی بسر اوقات کے لئے صنعت وحرفت کے نام سے ایک مدرسہ چندہ سے تعمیر کرایا تا کہ ریاست کے لوگ سرسید کے تعلیمی نظریہ کی طرح ''اپنی مدد آپ'' کے عادی ہوں۔ تربیتی ادارے میں جو عورتیں کام سیکھنے کے لئے داخل ہوتیں ان کو ماہانہ وظیفہ بھی دیا جاتا تھا۔

اپنی صاحبزادی آصف جہاں مرحومہ کے نام سے طبِ یونانی کی تعلیم کے لئے مدرسۂ طبی آصفیہ قائم کیا۔ بیگم سلطان جہاں کی تعلیمی کوششوں کا دائرہ صرف ریاست بھوپال تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ ان کا بارانِ فیض تمام ہندوستان پر برسا۔ ہندوستان کی کوئی مسلم انجمن یا تعلیمی ادارہ شاید ہی ہو جہاں ان کی مالی مدد شامل نہ ہو۔ندوۃ العلماٗ اور دارالعلوم دیوبند کو بھی انہوں نے مالی امداد فراہم کرائی۔وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے بعد 1920ء میں اس کی اولین چانسلر مقرر ہوئیں اور ان کے بعد نواب محمد حمید اللہ خاں بہادر جو اسی ادارے کے تعلیم یافتہ تھے اور ان کی رہائش کے لئے انہوں نے اپنی والدۂ محترمہ کے نام سے شاہجہاں منزل بھی تعمیر کرائی۔ وہ بھی اپنی مادرِ درس گاہ کے چانسلر منتخب ہوئے۔

اس سے قبل 1912ء میں وہ جارج پنجم کی رسمِ تاج پوشی میں شرکت کے لئے انگلینڈ بھی گئیں اور یوروپ کے مختلف شہروں کے علاوہ مصر کا بھی دورہ کیا۔ان کے اس سفر کا حال ان کی چھوٹی بہو شاہ بانو نے ''سفر نامۂ سلطانی'' کے نام سے شائع کیا۔ان کی سوانح عمری کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے۔

اس خاندان کی پانچویں حکمراں ساجدہ سلطان اپنے والد حمید اللہ خاں کے انتقال کے

بعد ان کی جانشین ہوئیں۔ لیکن اس وقت بھوپال بہ حیثیت ایک ریاست اپنی شناخت کھو چکا تھا اور مدھیہ پردیش کی راجدھانی بنا دیا گیا تھا۔ متواتر چار بیگمات کی حکمرانی کی بدولت بھوپال کی عورتوں میں اپنی اہمیت کا احساس اور جذبۂ خودداری بیدار ہوا۔ نواب بھوپال حمیداللہ خاں نے ریاست کو انڈین یونین میں ضم کرتے وقت یہ شرط رکھی تھی کہ زنانہ تعلیم یہاں حسب سابق ہمیشہ مفت دی جائے گی۔ بھوپال میں اسلامی شریعت کی پابندی اس حد تک ہے کہ وہاں ہندوستان کے دوسرے خطوں کے برعکس طلاق یا عقد بیوگان کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ (55)

بنگال میں بیگم رقیہ سخاوت حسین پہلی ایسی مسلم خاتون تھیں جنہوں نے عورتوں کی حالت پر سب سے پہلے قدم اٹھایا اور 1907ء میں لڑکیوں کا ایک اسکول قائم کیا۔ ان کی والدہ رحمت النسأ چودھرانی بھی پڑھی لکھی روایتی خاتون تھیں جب کہ ان کے والد ظہیر الدین محمد ابو علی صابر بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ رقیہ کے دو بھائی عبدالاسعد ابراہیم صابر اور خلیل الرحمٰن ابو ضیغم صابر نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر میں ہی حاصل کی تھی اور بعد میں کلکتہ کے سب سے معیاری کالج سینٹ زیویرز (St.Xavier's) کے تعلیم یافتہ تھے۔ رقیہ اور ان کی دو بہنوں کریم النسأ اور حمیرہ نے گھر پر ہی روایتی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس نے عربی اور اردو کے علاوہ بنگالی اور انگریزی زبان بھی سیکھی تھی۔ رقیہ کے بھائی ان کو گھر میں انگریزی پڑھاتے تھے۔

1896ء میں رقیہ کے والد ابراہیم نے ان کی شادی 16 سال کی عمر میں تیس سال کے سید سخاوت حسین سے کر دی جو اس وقت بنگال پریسیڈینسی میں بہار علاقے کے ضلع مجسٹریٹ تھے۔ سید سخاوت حسین لندن کے تعلیم یافتہ تھے اور بہت ہی روشن خیال انسان تھے۔ رقیہ اور ان کے شوہر بھاگلپور میں رہنے لگے۔

سید سخاوت حسین تعلیمِ نسواں کے حامی تھے اور ان کا خیال تھا کہ سماج کی برائیوں کا واحد علاج عورتوں کی تعلیم ہے۔ انہوں نے دس ہزار روپیہ کی رقم سے لڑکیوں کا ایک اسکول قائم کیا۔ 1909ء میں اپنے شوہر کے انتقال کے بعد وہ بھاگلپور سے کلکتہ منتقل ہو گئیں اور 16 / مارچ 1911ء کو سخاوت میموریل گرلس اسکول کے نام سے دوبارہ اسکول شروع کیا۔ لیڈی چیمس فورڈ (Chelsmford) جو گورنر جنرل کی اہلیہ تھیں انہوں نے بھی اس اسکول کا معائنہ کیا اور 1930ء

میں یہ اسکول ہائی اسکول ہو گیا۔ کلکتہ میں اب ان کا شمار ممتاز ہستیوں میں ہونے لگا اور وہ سماجی معاملات میں بھی دلچسپی لینے لگیں۔ 1916ء میں انہوں نے انجمنِ خواتین اسلام، بنگلہ قائم کی اور 1926ء میں انہوں نے بنگال ویمنز ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کی اور مرتے وقت تک مسلم عورتوں کی تعلیمی سرگرمیوں میں منہمک رہیں۔ 9/دسمبر 1932ء کو انہوں نے علی گڑھ میں منعقد انڈین ویمنز کانفرنس کی صدارت بھی کی تھی۔ اس طرح شیخ عبداللہ سے بھی ان کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ وہ ناری ادھیکار (حقوقِ نسواں) پر ایک کتاب بھی لکھ رہی تھیں مگر انتقال کی وجہ سے یہ کتاب مکمل نہیں ہو سکی۔

بیگم رقیہ سخاوت حسین کے کلکتہ اسکول سے پہلے خجستہ اختر بانو (بیگم سہروردی) نے 1909ء میں لڑکیوں کا ایک اسکول قائم کیا جو پرائیویٹ سیکنڈری اسکول کے طور پر 1938ء تک جاری رہا۔ (56) خجستہ اختر بانو بنگال یونیورسٹی میں فارسی کی ایگزامنر بھی تھیں اور کلکتہ یونیورسٹی کی وہ پہلی ایسی خاتون تھیں جنہیں 1911ء میں اس یونیورسٹی نے اعزازی ڈگری سے بھی نوازا تھا۔ اس اسکول سے قبل 1905ء میں کلکتہ میں انجمن گرلس ہائی اسکول قائم ہوا۔ بنگال میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 22 فیصد کے قریب ہے۔ 1991ء کی مردم شماری کے مطابق مغربی بنگال کی 64 فیصد مسلم خواتین ناخواندہ ہیں جب کہ 26 فیصد مسلم لڑکیاں ہی پرائمری تعلیم حاصل کرتی ہیں جس میں سے چھ فیصد مڈل کلاس تک کی تعلیم حاصل کرتی ہیں اور ایک فیصد سے کم ہی گریجویٹ تک کی تعلیم تک پہنچ پاتی ہیں۔ مغربی بنگال کے مدرسوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اس میں دینی تعلیم کا عنصر بہت کم ہوتا ہے اور ان مدرسوں کی نگہداشت کے لئے ویسٹ بنگال بورڈ آف مدرسہ ایجوکیشن بھی قائم ہے اور پورے بنگال میں حکومت سے منظور شدہ مدرسوں کی تعداد 496 ہے جب کہ اتر پردیش کے اعظم گڑھ ضلع میں ہی اس سے زیادہ مدارس ہیں۔ کلکتہ میں 19 مدرسے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے چل رہے ہیں۔ مغربی بنگال میں گذشتہ 30 سالوں سے کمیونسٹوں کی حکومت قائم ہے اور پوری ریاست میں ایک بھی مسلم ڈگری کالج نہیں ہے اور ''پورے ملک میں بنگال ہی ایک ایسا صوبہ ہے جہاں مڈل اور میٹریکولیشن میں مسلم لڑکیوں کی تعلیم میں تفریق سب سے زیادہ ہے'' (57) جب کہ اس ریاست میں ترقی پسندوں کی حکومت ہے۔

ہندوستان میں مغربی بنگال میں سرکاری اسکولوں کی تعداد سب سے کم ہے اور 95 فیصد مڈل اسکول پرائیویٹ لوگ چلاتے ہیں۔ سب سے زیادہ غربت اور سب سے کم تعلیم کے مواقع بنگال کے عام مسلمانوں اور خاص طور پر مسلم لڑکیوں کے لئے ہیں۔

مہاراشٹر میں جسٹس بدرالدین طیب جی اور فیضی خاندان نے لڑکیوں کی تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت اور فوقیت دی۔ طیب جی نے انجمنِ اسلام کے تحت 1876ء میں لڑکیوں کا ایک اسکول بھی قائم کیا اور اپنی بیگم کی زنانہ پارٹیوں میں شرکت کرنے کی حوصلہ افزائی کی اور انہوں نے یوروپین خواتین سے انگریزی بھی سیکھی۔ طیب جی کی بھتیجی بیگم علی اکبر فیضی نے 1894ء میں لندن کا سفر بھی کیا۔ ان کی دوسری بھتیجی بیگم حیدری بھی خواتین کے جلسوں میں برابر شریک ہوتی تھیں اور ہندوستان کے مشہور صنعت کار جمشید جی ٹاٹا سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ مغربیت کے دلدادہ اور روشن خیال طیب جی لڑکیوں میں پردے کے مخالف تھے۔ ان کا تعلق بوہرہ فرقے سے تھا اور تمام مسلمانوں میں یہ فرقہ زیادہ تعلیم یافتہ ہے اور ان کی خواتین بھی زیادہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہوتی ہیں۔

مہاراشٹر میں مہاتما جیوتی با پھولے اور ان کی اہلیہ ساوتری پھولے نے دلت خواتین کو علم کی دولت سے مالا مال کرنے کا بیڑہ اٹھایا جس کی وجہ سے انہیں سخت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہیں سے مہاراشٹر میں دلت تعلیم اور دلت بیداری کی بنیاد پڑی۔ مہاتما پھولے (Phuley) نے پونا میں لڑکیوں کے پرائیویٹ اسکول قائم کئے اور وہ خود ان میں تعلیم دیتے تھے۔ انہوں نے لازمی تعلیم کا مطالبہ سب سے پہلے کیا اور ہندوستان کی تاریخ میں وہ پہلے ایسے شخص تھے جنہوں نے 1852ء میں ہریجنوں کے لئے سب سے پہلا پرائیویٹ اسکول قائم کیا۔ (58) مہاراشٹر میں ہی مہادیو گووندرانا ڈے نے ''پرارتھنا سماج'' کے نام سے تحریک چلائی جس کا مقصد ذات پات اور مذہبی تفریق دور کرنے کے علاوہ تعلیمِ نسواں، عورتوں میں برابری اور بیوہ کی شادی جیسے مسائل کی حمایت کرنا اور کم عمری میں شادی کی مخالفت کرنا تھا۔ (59) ممبئی میں 1916ء میں مہارشی ڈی کے کاروے (Karve) نے پورے ملک میں عورتوں کی پہلی یونیورسٹی ایس این ڈی ٹی قائم کی (60)

ایس این ڈی ٹی خواتین یونیورسٹی، بمبئی کے مشہور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر کیشو کاروے کے ذہنِ رسا کا نتیجۂ فکر ہے۔ مسٹر کاروے سمجھتے تھے کہ ’’ہمارے معاشرے میں بہترین ماؤں، اچھی بیویوں اور قومی تعمیرِ نو میں حصہ لینے کے لئے، خواتین کی تعلیم و تربیت کلیدی اہمیت رکھتی ہے، اور یہ مقصد صرف اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جب کہ انہیں خواتین کے الگ سے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم دی جائے۔ 19ویں صدی میں ہندوستان میں خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے لئے سہولیات موجود نہیں تھیں جبکہ قومی بیداری اور سیاسی و اجتماعی سرگرمیاں، خواتین سے بھی اپنا منصبی حصہ ادا کرنے کا تقاضہ کرتی تھیں۔ خوش قسمتی سے خواتین یونیورسٹی کے اس پروگرام کو مشہور صاحبِ ثروت، سر وتھال داس تھیکر سے مالی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ سر وتھال داس نے پچاس لاکھ روپیہ کا خطیر عطیہ دیا، جس سے یونیورسٹی کو مضبوط مادی بنیاد فراہم ہوگئی۔ 1920ء میں یہ تعلیمی ادارہ سر وتھال داس کی والدہ متوفیہ شریمتی ناتھیبابائی دمودر تھیکر سے کے نام سے ایس این ڈی ٹی موسوم ہوا یعنی SNDT Women's University اس سے قبل 1916ء میں پہلا کالج پونا میں صرف چار طالبات کے داخلے سے شروع کیا گیا تھا۔ بقول مسٹر کاروے ’’ہمارا یہ اقدام اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف تھا۔‘‘ (61)

ہندوستان میں انیسویں صدی کا آخری حصہ اور بیسویں صدی عورتوں کی تعلیم اور ان کی آزادی کی جدوجہد کے لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ پہلی عالمی جنگ کے نتیجہ میں ہندوستان کی برٹش سرکار نے لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق نئی پالیسی وضع کی تاکہ لڑکیوں کو رسمی تعلیم کے علاوہ پیشہ وارانہ تعلیم بھی مہیا کرائی جائے۔ 1917ء میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن جسے سیڈلر (Sadler) کمیشن بھی کہا جاتا ہے، قائم کیا گیا۔ اس کمیشن میں ایم اے او کالج کے سابق طالب علم ڈاکٹر سر ضیاء الدین کو بھی ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے کمیشن کا رکن نامزد کیا گیا۔ (62) اس کمیشن نے سفارش کی کہ عورتوں کی تعلیم کے لئے خصوصی بورڈ تشکیل دیا جائے اور خصوصی نصاب مرتب کیا جائے جو خواتین کی ضروریات کو پورا کرے۔ (63)

ہندوستان کے قومی رہنما انگریزوں کے بنائے ہوئے ہندوستانیوں کے طریقۂ تعلیم سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایسا نظامِ تعلیم ہو جو ان کی ملکی اور ملّی ضرورتوں کو پورا کرتا

ہو۔ ایک ممتاز اسکالر پنڈت مدن موہن مالویہ نے 1916ء میں بنارس ہندو یونیورسٹی قائم کی اور 1920ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وجود عمل میں آیا جسے 1875ء میں مدرسۃ العلوم مسلمانانِ ہند کے نام سے سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاً نے قائم کیا تھا۔

1921-22ء تک پورے ہندوستان میں لڑکیوں کے 19 کالج، 675 سیکنڈری اسکول اور 21 ہزار 956 پرائمری اسکول تھے۔ اس دور میں لڑکیوں کی شادی کی عمر میں بھی اضافہ کر دیا گیا اور لڑکیوں کو روزگار کے مواقع فراہم کرانے کے لئے اور انہیں اپنا کیریئر چننے کے مواقع بھی فراہم ہو گئے (64)

سیاسی اصلاحات اور آزادی کے لئے یہ ضروری تھا کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی حقِ رائے دہندگی دیا جائے۔ اس مطالبہ کو لے کر ہندوستانی عورتوں کا پہلا وفد سروجنی نائیڈو کی قیادت میں مملکتِ ہند کے سکریٹری مسٹر مانٹیگو سے 1919ء میں ملا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ویمنز انڈین ایسوسی ایشن نے سب سے پہلے عام ہندوستانی عورتوں کی ایک کل ہند کانفرنس بلانے کا اعلان کیا۔ حقِ رائے دہندگی کے مطالبہ کے منسوخ ہونے کے بعد عورتوں کی جدوجہد کچھ اور تیز ہو گئی۔ تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت دنیا کے بہت سے ملکوں میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں تھا۔ شاید دنیا میں عورت کو ووٹ دینے کا سب سے پہلا حق نیوزی لینڈ میں 1893ء میں دیا گیا۔ اس کے بعد 1902ء میں آسٹریلیا، 1917ء میں انگلینڈ، 1918ء میں کینیڈا اور 1941ء میں منگولیا کی عورتوں کو حقِ رائے دہندگی ملا۔ 1926ء میں پہلی بار ہندوستانی عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہو گیا اور 1931ء میں ہندوستانی خواتین کو انتخاب میں حصہ لینے کا حق بھی۔ (65)

ملک کی تحریکِ آزادی میں عورتیں بھی شامل ہونے لگیں۔ مثلاً مسز اینی بیسنٹ، کستوربا گاندھی، سروجنی نائیڈو، علی گڑھ کے نامور سپوت مولانا محمد علی اور شوکت علی کی والدہ بی اماں، کملا نہرو، وجے لکشمی پنڈت اور محترمہ اندرا گاندھی۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے سب سے پہلے طالب علم جسٹس حمید اللہ کی بیگم خورشید پیش پیش تھیں۔ یہ خواتین ایک طرف ملک کو آزاد کرانے میں سرگرمِ عمل تھیں، وہیں دوسری طرف عورتوں کے سماجی بہبود کے کاموں میں بھی فعال تھیں۔

نمک ستیہ گرہ کے موقعہ پر بہت سی عورتیں ساحل سمندر پر بہادر سپاہیوں کی طرح ہتھیاروں کی جگہ ہاتھوں میں نمک لئے ہوئے کھڑی ہوئی تھیں۔ جنگِ آزادی میں خواتین کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ ''جنگِ آزادی میں عورتوں نے جو کام کیا ہے وہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا''

1931ء کی مردم شماری کے مطابق پورے ملک میں خواندگی کی شرح آٹھ فیصد تھی۔ ان میں انگریزی خواندگی کی تعداد ایک فیصد تھی جب کہ پورے ملک میں مسلمانوں کی شرح خواندگی محض 5.4 فیصد تھی اور ان میں انگریزی خواندگی کی تعداد 77%. تھی۔ اتر پردیش میں 1931-32ء میں پرائمری سطح پر آٹھ لاکھ 93 ہزار 578 بچے اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے جب کہ اس کے برخلاف مسلمان بچوں کی تعداد ایک لاکھ 97 ہزار 093 تھی۔ مڈل سطح پر ایک لاکھ 12 ہزار 134 ہندو بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے اور مسلمان بچوں کی تعداد 21.736 تھی۔ ہائی اسکول سطح پر پندرہ ہزار 638 غیر مسلم اور مسلمانوں کی تعداد 3 ہزار 994 تھی۔ انٹر میڈیٹ اور یونیورسٹی سطح پر آٹھ ہزار 646 ہندو نوجوان تعلیم حاصل کر رہے تھے جب کہ مسلمانوں کی تعداد 2 ہزار 154 تھی۔ درمیان میں تعلیم چھوڑ دینے کا رواج ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں میں زیادہ تھا۔ (66)

1931ء میں کراچی میں منعقد انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں عورتوں کو بہت سے بنیادی اور دستوری حقوق دینے کا اعلان کیا گیا اور اعلانیہ میں کہا گیا کہ ''جنس کے اختلاف کی بنا پر کوئی تخصیص نہیں برتی جائے گی۔''

لڑکیوں کے تعلیمی نصاب میں بھی انقلابی تبدیلی رونما ہونے لگی اور نئے طریقے کے کالج لڑکیوں کے لئے قائم ہونے لگے۔ 1932ء میں نئی دلی میں لیڈی ارون ہوم سائنس کالج قائم ہوا۔ لڑکیوں کو بھی قانون، میڈیسن، کامرس، زراعت، انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کے مواقع فراہم ہو گئے اور ملک کی تقسیم کے وقت 47-1946ء میں دو لاکھ 18 ہزار 165 تعلیمی اداروں میں لڑکیوں کے اداروں کی تعداد 28 ہزار 196 تھی۔ ان میں سے 59 آرٹس اور سائنس کے کالج، دو ہزار 370 سیکنڈری اسکول اور 21 ہزار 479 پرائمری اور چار ہزار 288 پیشہ ورانہ

تعلیم کے ادارے صرف لڑکیوں کے تھے۔ (67)

مشہور زمانہ قلم کار سلمان رشدی کہتے ہیں کہ آزادی سے قبل ہی ہندوستان کی مسلم خواتین کی حالت میں تبدیلیاں آنا شروع ہوگئی تھیں۔ مشہور سماجی مصلح جیسے سید احمد خاں جنہوں نے 1875ء میں علی گڑھ میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا اور خواتین جیسے آمنہ طیب جی اور شیخ محمد عبداللہ کی بیگم نے ایک سے زیادہ شادیوں کی مخالفت کی اور تعلیمِ نسواں کو فروغ دیا۔ ملک کی آزادی کی جدوجہد کے دوران بہت سی مسلم خواتین نے ستیہ گرہ اور عدم تعاون تحریک میں حصہ لیا۔ (68)

آل انڈیا ویمنز کانفرنس کے 1928ء کے اجلاس میں ایک مسلم خاتون کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ (ریڈنگ رشدی: صفحہ 139)

قرۃ العین حیدر تعلیم یافتہ مسلم خواتین سے متعلق معلومات فراہم کرتی ہیں کہ ''ہندوستان میں بہت سی لڑکیاں گریجویٹ ہو چکی تھیں اور ولایت ہو کر آئی تھیں۔ غازی پور میں ہمارے یہاں 1933ء میں تین ایسی ہی مسلم خواتین کا اجتماع رہتا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے ڈاکٹر ولی محمد کی بیٹی زیب امجد علی آئی ٹی کالج کی گریجویٹ تھیں۔ مس ڈاکٹر حمید جہاں انسپکٹر آف گرلس اسکولس اور علی گڑھ کے میر ولایت حسین کی بیٹی ڈاکٹر زبیدہ صالح جو لیڈی ہارڈنگ کالج کی تعلیم یافتہ اور ضلع کے زنانہ ہسپتال کی انچارج تھیں۔ لیکن اس زمانے میں رام پور ہی کی عذرا اور زہرہ جو صاحبزادہ ممتاز اللہ خاں کی لڑکیاں تھیں۔ عذرا نے بی اے کے امتحان میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کی اور بعد میں لندن یونیورسٹی میں بھی پڑھا اور وہاں سے ڈگری لی۔ یہ دونوں یوروپ میں اودے شنکر کے ٹروپ میں شامل ہوگئیں۔ (69)

اس سلسلے میں علی گڑھ کی ایک اور روشن خیال طالبہ حمیدہ اختر حسین اپنی آپ بیتی میں زہرہ اور عذرا کی زندگی پر مزید روشنی ڈالتی ہیں کہ ممتاز اللہ خاں ڈاکٹر رشید جہاں کے شوہر محمود الظفر کے چچا تھے اور ان کے بیٹے ذکاء اللہ خاں کا لڑکپن سے ان کے گھر آنا جانا تھا کہ ان کے والد ممتاز اللہ خاں حمیدہ اختر کے والد ظفر عمر نیلی چھتری والوں کے عزیز دوستوں میں سے تھے۔ ظفر عمر کے صاحبزادے شاکر عمر، مشہور کمیونسٹ لیڈر کنور اشرف اور ذکاء اللہ تینوں گہرے دوست اور کلاس فیلو تھے۔ تینوں نے ایک ساتھ ولایت میں بھی تعلیم حاصل کی تھی۔

حمیدہ اختر حسین رائے پوری کا کہنا ہے کہ ممتاز اللہ خاں بڑے ہی روشن خیال تھے کہ اپنی دو بیٹیوں زہرہ اور عذرا کو اودے شنکر کے ساتھ کام کرنے کی اجازت خوشی خوشی دے دی کہ جب قدرت نے ان کو ناچ اور ایکٹنگ کے لئے صلاحیت دی ہے تو کیوں نہ استعمال کریں۔ سوچئے تو آج سے ساٹھ سال پہلے مسلمان لڑکیوں کے لئے سرِ عام اسٹیج پر آ کر ناچنا اور ایکٹنگ کرنا کیا معنی رکھتا ہوگا۔ خاندان والوں اور دوستوں کی لعن طعن کی بوچھار سی ان پر ہوتی مگر انہوں نے اس کی پرواہ نہ کی۔ بعد میں زہرہ کی شادی سہگل نامی ایک ہندو سے ہوئی۔ اس طرح وہ زہرہ سہگل کے نام سے مشہور ہوئیں اور لندن میں بود و باش اختیار کر کے وہاں اپنا ایک ڈانسنگ اسکول کھول لیا۔

لندن میں بہت سے اسٹیج کے ڈراموں اور فلموں میں بھی کام کیا۔ اب ہندوستان میں ٹی وی سیریل اور فلموں میں کام کر رہی ہیں۔ عذرا کی شادی حمید بٹ سے ہوئی اور وہ بمبئی میں رہنے لگیں۔ بہت سی فلموں میں کام بھی کیا۔ گاہے گاہے ٹی وی کے ڈرامے کرتی رہیں، پھر پاکستان آ گئیں۔ اسی طرح اب تک تھیٹر اور ڈراموں میں حصہ لیا کرتی ہیں۔ زہرہ سہگل تین ہفتہ کے لئے پاکستان آئیں تو دونوں بہنوں نے اپنی بھتیجی زارا ممتاز اور کامل ممتاز (جوان کے بھتیجے ہیں) ان کی لڑکی ثمینہ ممتاز کے ساتھ مل کر ایک اسٹیج شو لاہور اور پھر کراچی میں کیا۔ اس طرح ایک ہی خاندان کی چار نسلیں ایک ساتھ اداکاری کر رہی تھیں۔ ''ایک تھی نانی جس نے وہاں اور یہاں دیکھا ہے۔ وہ کچھ ایسا تھا کہ کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔'' (70)

حجاب کو 1936ء میں ہوابازی کا لائسنس ملا۔ کھیل کے میدان میں مس خانم حاجی انڈیا ٹینس چیمپئن رہیں۔

سارے برِصغیر میں پشاور سے لے کر راس کماری تک مسلمان عورتوں کی تحریکیں بہت فعال اور منظم تھیں۔ حیدر آباد دکن ایک درخشندہ باب تھا کہ وہاں کے نظام حیدر آباد کی پالیسی کی بدولت لڑکیوں کو بلاتخصیص مذہب و ملت اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ بھیجا جاتا تھا۔ کلکتہ کا سہروردی خاندان اور بمبئی کے فیضی اور طیب جی گھرانے اپنی اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کے لئے مشہور تھے۔ متعدد خاندانوں کی عورتوں نے پردہ ترک کر دیا تھا اور ان کی لڑکیاں کالجوں میں پڑھ رہی تھیں۔ مسلم خواتین سیاست میں آ گئی تھیں.... بیگم کلثوم شاہد حسین ایم ایل اے مراد آباد، اسمبلی کے

اجلاس میں جایا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں خواتین لیڈر رشیدہ لطیف، بیگم جہاں آرا، شاہنواز، لیڈی محمد شفیع، بیگم حبیب اللہ... یہ سب سروجنی نائیڈو کو اپنی رفیق کار مانتی تھیں۔

ملک کی آزادی کے بعد ہندوستان کے آئین میں تمام شہریوں کے ساتھ مساوی سلوک کرنے کی ضمانت دی گئی اور دستورِ ہند کی دفعہ 45 کے تحت چودھا سال کی عمر تک کے بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم مہیا کرانے کا تہیا کیا گیا جس کے نتیجہ میں آزادی کے بعد سے لڑکیوں کی تعلیم میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ 1951ء میں جہاں لڑکیوں کی تعلیم کا تناسب صرف 7.9 فیصد تھا وہیں 2001ء میں ہندو لڑکیوں کی شرح خواندگی 53.2 فیصد تک ہو گئی ہے جبکہ مسلم لڑکیوں کی شرح خواندگی 2001ء کی مردم شماری کے مطابق 50.09 فیصد تھی جبکہ ہندو لڑکوں اور مسلم لڑکوں کے درمیان شرح خواندگی کے تناسب میں بہت زیادہ فرق ہے۔ ہندو لڑکوں کی خواندگی 76.16 فیصد ہے اور مسلم لڑکوں کی شرح خواندگی کا تناسب 67.66 فیصد ہے۔ 2001ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی دیگر مذہبی اقلیتوں میں جین لڑکیوں کی خواندگی کا تناسب 90.58 فیصد، عیسائی لڑکیوں کا 76.16 فیصد، سکھ لڑکیوں کا 63.09 فیصد اور بدھسٹ کا 61.69 فیصد ہے۔ (71) اس طرح ہندوستان کے مسلمان لڑکے اور لڑکیاں قومی سطح پر تعلیم کے میدان میں سب سے زیادہ پسماندہ ہیں۔

آزادی کے بعد پلاننگ کمیشن نے جو پہلا پنج سالہ منصوبہ (1951-56ء) تیار کیا اس میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے پرائمری سطح پر چالیس فیصد اور سیکنڈری سطح پر دس فیصد اندراج کرانے کا نشانہ مقرر کیا اور اس طرح ہر پنج سالہ منصوبہ میں تعلیمِ نسواں کے فروغ کے لئے کوششیں کی جاتی رہیں مگر اس کے خاطر خواہ نتائج نہیں نکلے۔

ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن کی سربراہی میں 1948-49ء میں یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن نے لڑکوں کے کالجوں میں لڑکیوں کو بھی تعلیم کے مواقع فراہم کرانے، ان کالجوں میں لڑکیوں کے ساتھ تفریق نہ برتنے، نئے کالجوں کے قیام اور خواتین ٹیچروں کو بھی مرد ٹیچروں کے مساوی تنخواہ دئے جانے کی سفارش کی گئی۔ (72)

1952-53ء میں سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن نے لڑکیوں کے لئے ہوم سائنس کی تعلیم

کے لئے خصوصی سہولیات فراہم کرانے کے ساتھ مخلوط تعلیم کی حمایت کے ساتھ ساتھ ریاستی سرکاروں سے کہا کہ اگر لڑکیوں کے اسکولوں کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو الگ سے لڑکیوں کے اسکول قائم کئے جائیں۔

شریمتی درگابائی دیشمکھ کی صدارت میں نیشنل کمیٹی آن ویمنز ایجوکیشن 1958ء میں قائم کی گئی جس کا بنیادی مقصد پرائمری اور سیکنڈری سطح پر لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان تعلیم کے میدان میں جو خلیج تھی اس کو پورا کرنے کے لئے سفارشات پیش کرنا تھا۔

اس کمیٹی کا خیال تھا کہ تعلیمِ نسواں کو ملک کا ایک اہم اور خصوصی مسئلہ تصور کیا جائے اور ریاستی سرکاریں لڑکیوں اور خواتین کی تعلیم کے لئے اسٹیٹ کونسل قائم کریں۔ تعلیمِ نسواں کو فروغ دینے کے لئے ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ قائم کئے جائیں۔ دیہی علاقوں میں کام کرنے والی استانیوں کے لئے مکان مہیا کرائے جائیں اور دیہی بھتہ مہیا کرایا جائے تاکہ شہری اور دیہی علاقوں کے درمیان تعلیم کے تناسب کو کم کیا جاسکے۔

پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھنے والی طالبات کو مفت ٹرانسپورٹ کی سہولت مہیا کرائی جائے اور تعلیمِ نسواں کو فروغ دینے کے لئے اقامتی سہولتیں بھی فراہم کرائی جائیں۔ ساتھ ہی تعلیمِ نسواں کی حوصلہ افزائی کے لئے انہیں خاطر خواہ تعداد میں اسکالرشپ مہیا کرائے جائیں۔

مشہور صحافی راجیند ریادو کی ادارت میں شائع ہونے والے ہندی ماہنامے ''ہنس'' کے اگست 2003ء کے شمارے میں ''ہندوستانی مسلمان! حال اور مستقبل'' کے عنوان سے پروفیسر عرفان حبیب کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ'' اقتصادی نابرابری خود ہی مسلمانوں کی خواندگی کی شرح کی ایک واجب وضاحت ہے، لیکن زیادہ تر بحث و مباحثوں میں مسلم بچوں کی جانب سے تعلیمی سہولیات کا فائدہ نہ اٹھانے کے مسئلہ کو لے کر کیا جاتا ہے۔ وہ دراصل حقائق کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ سب سے پہلے 1947ء کے بعد عام بول چال میں استعمال ہونے والی زبان کے روپ میں عملاً نیست و نابود کرنا، ہندوستانی بولنے والے علاقوں میں تب جو مسلمان خواندہ تھے وہ دراصل اردو زبان میں خواندہ تھے۔ 1947ء کے بعد جہاں تک سرکاری کاموں سے وابستہ کسی بھی چیز کا تعلق تھا اس میں سے اردو کو استعمال سے بے دخل کردیا

گیا تھا، بھلے ہی کاغذوں پر نہیں۔ یہ بھی لوگ عملاً اردو بولنے اور لکھنے والے تھے۔ زبان سے متعلق یہ لسانی تعصب بھی ناخواندگی کی ایک بڑی وجہ بنی۔ آج انہیں حالات کی وجہ سے بڑی تعداد میں مسلمان ہندی کی طرف چلے گئے اور عام طور سے ہندی زبان میں ہی خواندہ ہیں لیکن اس شفٹنگ نے ایک ضروری قیمت وصول کی ہے، نہ صرف تہذیبی معاملات (اردو کی مالا مال وراثت بڑے پیمانے پر کھوگئی)، بلکہ اس نے مسلم خواندگی کو بھی متاثر کیا ہے کیونکہ ہندی ان کے گھروں میں استعمال کی جانے والی زبان نہیں تھی۔"

پروفیسر عرفان حبیب کا یہ بھی خیال ہے کہ "جدید تعلیم پر مسلمانوں کا اتنا ہی حق ہے، جتنا دوسروں کا اور اسے یقینی بنانے کے لئے خصوصی کوششیں کی جانی چاہئیں کہ ان علاقوں میں سرکاری تعلیمی ادارے کھولے جائیں، جہاں مسلمانوں کی گھنی آبادی ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ ان اسکولوں میں بہتر طور پر پڑھائی بھی ہو۔" (73)

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کی شعبۂ سیاسیات کی پروفیسر زویا حسن مسلم سماج میں عورتوں کی بدحالی کی وجہ مذہبی نہیں بلکہ معاشی تسلیم کرتی ہیں۔ پروفیسر زویا ہندوستان کی غالباً ایسی خاتون ہیں جنہوں نے مسلم خواتین پر سب سے زیادہ سروے کئے ہیں۔ ہر چند کہ ان کا تعلق مارکسوادی نظریہ سے ہے اور ہندوستان کی ایک آدھ خاتون مصنف کو چھوڑ کر ان سبھی دانشور خواتین نے مسلم پرسنل لاء اور مسلم عورتوں میں پردے کو ان کی ناخواندگی اور پسماندگی کی بنیادی وجہ قرار دیا ہے۔ مگر زویا حسن کا یہ سروے زمینی حقیقتوں پر مبنی ہے اور انہوں نے بہت دیانت داری سے مسلم خواتین کے متعلق اپنے ذاتی مشاہدے بیان کئے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ "مسلم عورتوں کی حالت پر غور کرتے وقت ایک اہم نظریہ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر ہے، سماجی اور اقتصادی پہلوؤں پر ان عورتوں کی حالت کو پرکھا جانا۔ اب تک ان پہلوؤں کے تحت مسلم عورت کی حالت پر بات نہیں کی گئی۔ مسلم عورتوں کی صورتِ حال پر سوچتے وقت فوکس میں ہمیشہ مسلم پرسنل لاٗ ہوتا ہے، اس کا لیگل اسٹیٹس ہوتا ہے۔"

پروفیسر زویا حسن کہتی ہیں کہ "مسلم عورتوں کے پاس اقتصادی آزادی نہیں ہے، ان میں تعلیم کا فقدان ہے۔ ان کی پڑھائی چھوڑنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مسلم عورتیں پردے میں رہتی

ہیں، مخلوط تعلیمی ادارے زیادہ ہیں، یہ وجوہات بہت معمولی ہیں، مسلم عورت کی ہندوستان میں تعلیم حاصل نہ کرنے کی اصل وجہ ان کی غربت اور افلاس ہے۔ ان کی حالت پسماندہ طبقات کی طرح ہی ہے۔ جس وجہ سے دلت عورتیں نہیں پڑھ پاتیں، اسی وجہ سے مسلم عورت بھی نہیں پڑھ پاتیں، مذہب اور پردہ اتنی بڑی وجہ نہیں ہے۔ سماجی اور اقتصادی پہلوؤں کو نظرانداز کر کے مسلم خاتون کی حالت کو صحیح ڈھنگ سے سمجھا نہیں جاسکتا۔ سروے سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلم عورتوں کی حالت کو مذہب کے نظریے سے دیکھنا غلط ہے۔ ان کی سماجی، اقتصادی بنیاد کمزور ہے، وہ دلت سے تھوڑی سی اوپر اور دوسرے پسماندہ طبقات سے نیچے ہیں۔ ان کی خراب حالت کی وجہ مذہب یا مذہبی قاعدے قانون نہیں ہیں۔

پروفیسر زویا حسن نے ایک دلچسپ نتیجہ یہ بھی نکالا ہے کہ جنسی تفریق کے معاملے، مثلاً خاندان میں فیصلہ لینے کے معاملے، باہر آنے جانے کا سوال، گھریلو جھگڑے وغیرہ میں مسلم اور ہندو عورتوں میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ لیکن سماجی، اقتصادی حالت، تعلیم اور ملازمت میں مسلم اور ہندو عورتوں میں فرق ہے۔ ایسا اسلئے ہے کہ ہندو عورتوں کی تعلیمی حالت بہتر ہے، مسلم عورتوں میں اس کی کمی ہے اور اس کی اصلی وجہ غریبی ہے۔

سروے کے مطابق محض چودھا فیصد مسلم عورتیں کام کرتی ہیں جبکہ تیس فیصد دلت عورتیں اور بائیس فیصد دیگر پچھڑے طبقات کی عورتیں کام کرتی ہیں۔ سب سے اہم نتیجہ یہ نکل کر آیا کہ محض 0.4 فیصد مسلم عورتوں نے کہا کہ وہ پردے کی وجہ سے کام نہیں کر پاتیں، یہ فیصد ایک سے بھی کم ہے، اس سروے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم خواتین پردے کی وجہ سے کام پر نہیں جا پاتیں، ایسی بات نہیں ہے۔ (74)

ملک کی آزادی کے بعد 52 -1951ء میں پورے ملک میں کالج اور یونیورسٹی سطح پر لڑکیوں کا اندراج تقریباً چالیس ہزار تھا جو اب بڑھ کر 42 لاکھ تک پہنچ گیا ہے۔ ابتدائی تعلیم کو لازمی بنانے کے لئے قومی سطح پر سروشکھشا ابھیان بھی شروع کیا گیا ہے۔ اس قومی پروگرام کے تحت لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم پر خاص توجہ دی گئی ہے تا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان تعلیمی تناسب کو کم کیا جاسکے۔ 2006-2005ء کے تعلیمی سال میں لڑکیوں کے کالجوں کی تعداد 17 ہزار

800 تک پہنچ گئی ہے اور پورے ملک میں اس وقت سات ویمنز یونیورسٹیاں بھی قائم ہو چکی ہیں جن میں صرف لڑکیوں کو ہی اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کئے گئے ہیں۔

جہاں تک ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کی تعلیم کا معاملہ ہے، مسلمان قومی سطح پر تعلیمی طور پر پسماندہ ہیں اور خود حکومتِ ہند نے اپنی دستاویزات میں اس حقیقت کو تسلیم بھی کیا ہے۔ مسلمانوں کی ناخواندگی اور پسماندگی کو دور کرنے کے لئے جو بھی منصوبے بنائے گئے بدقسمتی سے فرقہ پرست افسران نے ان پر عمل نہیں ہونے دیا۔ مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے گوپال سنگھ کی سربراہی میں قائم پینل کی رپورٹ، اردو کے سلسلے میں گجرال کمیٹی کی رپورٹ، 1986ء میں قومی تعلیمی پالیسی میں مسلمانوں کی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے بنائے گئے ایکشن پلان پر ابھی تک عمل نہیں ہو سکا ہے۔

جب کہ بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں سے مسلمانوں میں اسکولی تعلیم کے تئیں کافی بیداری آئی ہے اور خصوصی طور پر لڑکیوں کی تعلیم کے لئے۔ آج ایک بڑی تعداد میں مسلم گھرانوں کی صنفِ نازک گھر کی دہلیز سے باہر نکل کر تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ وہ پڑھنا چاہتی ہیں، خود مختار ہونا چاہتی ہیں اور اقتصادی طور پر خود اپنی ذات پر منحصر ہونے کی خواہش مند نظر آتی ہیں۔ آج مائیں اپنی بچیوں کو تعلیم دلانے کے لئے فکر مند نظر آتی ہیں۔ ایسی بھی مثالیں موجود ہیں جہاں پر مسلم طالبات ٹیوشن پڑھاتی ہیں، خود پڑھتی ہیں اور غریب بچوں کے لئے اسکول چلاتی ہیں تاکہ تعلیمِ نسواں کو فروغ حاصل ہو۔

جنوبی ریاستوں میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت شمالی ریاستوں سے بہت بہتر ہے۔ کیرالا کی سرکار کا رویہ اقلیتوں کے تئیں ہمدردانہ ہے۔ وہاں پہلی کلاس سے آٹھویں درجہ تک پڑھائی چھوڑ دینے والوں کی تعداد صفر ہے۔ کالی کٹ کا الفاروق کالج جنوب میں منی مسلم یونیورسٹی سمجھا جاتا ہے۔ وہاں کی مسلمان رضا کار تنظیمیں بھی تعلیم کے میدان میں قائدانہ کردار ادا کر رہی ہیں۔

کرناٹک میں الامین تحریک نے ایک تعلیمی انقلاب برپا کر دیا ہے۔ الامین تحریک کے بانی ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی والدہ خود علی گڑھ کی تعلیم یافتہ تھیں اور ممتاز آپا کی گہری دوست تھیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک مرتبہ اپنی ماں کی خواہش پر میرے ساتھ گرلس کالج گئے تاکہ وہ اس اسکول کو

دیکھ سکیں جہاں ان کی والدہ پڑھتی تھیں۔اس تنظیم نے تعلیم میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد صحت اور معاشیات میں بھی قدم رکھا ہے۔گلبرگہ کی بندہ نواز گیسو دراز کی درگاہ کی آمدنی سے لاتعداد تعلیمی ادارے چل رہے ہیں جن میں میڈیکل کالج، انجینیئر نگ کالج اور لڑکیوں کے ڈگری کالج بھی شامل ہیں۔کرناٹک میں اردو کی صورتِ حال پورے ملک میں سب سے بہتر ہے۔

تمل ناڈو میں مسٹر عبدالرحمٰن کی قیادت میں سیتا کاتھی ٹرسٹ نے بے شمار تعلیمی ادارے قائم کئے ہیں۔شمال میں جو کام شیخ محمد عبداللہ نے کیا تمل ناڈو میں وہی کام جسٹس بشیر احمد سعید نے کیا۔انہوں نے تمل ناڈو میں تعلیمِ نسواں کو فروغ دیا۔جسٹس بشیر احمد سعید کے نام سے لڑکیوں کا ایک شاندار ڈگری کالج بھی ہے۔

مہاراشٹر میں مسلمانوں کی فعال انجمنوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ان انجمنوں میں سب سے نمایاں نام انجمنِ اسلام کا ہے جسے بدرالدین طیب جی نے 1874ء میں قائم کیا تھا اور اب اس انجمن کا مقصد لڑکیوں کی ایک مسلم یونیورسٹی قائم کرنا ہے۔

آندھرا پردیش میں شاداں ایجوکیشن سوسائٹی، مدینہ ایجوکیشن سوسائٹی، عابد علی خاں ایجوکیشن ٹرسٹ نے تعلیمی ہل چل پیدا کر دی ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے اکیسویں صدی کا استقبال اپنی ناخواندگی اور پسماندگی کو دور کرنے کے لئے اپنے اپنے علاقوں میں اپنے محدود ذرائع سے تعلیمی اداروں کے قیام سے کیا ہے اور تعلیم مسلمانوں کے ایجنڈے میں شامل ہوگئی ہے۔ہر چند کہ مسلم فرقہ کو ہندوستان کی سیکولر اور جمہوری حکومت سے کوئی خاص سہولیات فراہم نہیں ہیں اور دستورِ ہند نے ملک کے تمام شہریوں کو سماجی انصاف کا جو حق دیا تھا وہ اس حق سے ابھی تک عملی طور پر محروم ہیں۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں ہندوستان کے علماً کی اکثریت تعلیمِ نسواں کی مخالف تھی مگر اب زمینی حقیقتوں اور متعدد جائزوں سے یہ حقیقت منکشف ہو رہی ہے کہ اب مسلمانوں کی اکثریت نے اپنی لڑکیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے اور خوش آئند پہلو یہ ہے کہ تعلیمِ نسواں کی اس مانگ کو پورا کرنے میں علماً کا طبقہ بھی پیش پیش ہے۔

حالیہ چند برسوں میں ملک کی مختلف ریاستوں میں متعدد علماً نے لڑکیوں کے لئے

مخصوص اعلیٰ سطح کے مدارس قائم کئے ہیں اور ان میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اب ہندوستان کا تعلیم یافتہ مسلمان یہ محسوس کرتا ہے کہ ان کے بچوں کی صحیح تربیت ایک تعلیم یافتہ ماں ہی کر سکتی ہے۔۔ ٹی وی اور فلموں کے ذریعہ جس طرح فحاشی اور عریانیت سماج میں عام ہو رہی ہے اور مغربی تہذیبی یلغار نے ہندوستانیوں کی تہذیبی اور ثقافتی شناخت کو متاثر کیا ہے اس کا ایک حل یہ بھی ہے کہ ان کو اسلامی تعلیمات کی تربیت دی جائے۔

ہندی بولنے والی ریاستوں میں جس طرح مسلمانوں کی زبان اردو کو ختم کیا گیا اور جس طرح کا ہندوانہ نصابِ تعلیم وضع کیا گیا اس کی وجہ سے بھی مسلمانوں نے محسوس کیا کہ ایک متبادل نظامِ تعلیم لڑکیوں کا وضع کیا جائے تاکہ وہ علماء کی طرح عالمہ بن کر نکلیں۔ ان جامعۃ الدینیات میں صرف دینی تعلیم ہی نہیں بلکہ امورِ خانہ داری کی بھی تربیت دی جاتی ہے جن سے ان طالبات کو گھریلو کام کاج کو اسلامی طریقے کے مطابق انجام دینے کی تربیت حاصل ہو جائے۔ لڑکیوں کے ان اسکولوں میں قرآن وسنت کی روشنی میں لڑکیوں کو جو حقوق دئے گئے ہیں، ان کے بارے میں بھی پوری طرح سے تیار کیا جاتا ہے تاکہ مردوں کے استحصال کے معاملوں پر قابو پایا جا سکے۔ ان دینی مدارس میں ان کو ایسی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے جس سے کہ ایک تعلیم یافتہ مسلم خاتون اسلام کے دئے ہوئے حقوق سے واقف ہو جائے اور حقِ وراثت اور طلاق جیسے پیچیدہ معاملات میں شوہر کے ہاتھوں شرعی قوانین کی خلاف ورزی کرنے پر اپنے شوہر کو چیلنج کر سکیں۔ اس طرح تعلیم یافتہ بیویاں اور مائیں گھریلو معاملات میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔

اعظم گڑھ کے بلریا گنج میں واقع جامعۃ الفلاح میں لڑکیوں کے اس مدرسہ میں ہزاروں لڑکیاں زیرِ تعلیم ہیں جنہیں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی مہیا کرائی جاتی ہے اور برصغیر ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں اپنی نوعیت کا یہ سب سے بڑا مدرسہ ہے۔ یہاں اسلامی فقہ کے ساتھ ساتھ صحافت کی بھی مشق کرائی جاتی ہے اور ہوم سائنس بھی ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے نصاب میں شامل ہے۔ اس مدرسہ کی بہت سی لڑکیاں اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رخ اختیار کرتی ہیں اور جن میں سے بعض ڈاکٹری (طبِ یونانی) کا پیشہ اختیار کرتی ہیں۔ لڑکیوں کو قرب وجوار کے علاقوں سے لانے لے جانے کے لئے بسوں کا انتظام

ہے اور لڑکیوں کو کمپیوٹر کی ٹریننگ بھی دی جاتی ہے تاکہ وہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس دور میں اپنا کیریئر شروع کر سکیں۔

اتر پردیش کے رامپور شہر میں جامعۃ الصالحات کے نام سے قائم اس مدرسہ میں چار ہزار سے زائد لڑکیاں مختلف علوم وفنون کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور عالمہ وفاضلہ بننے کے بعد یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مختلف کورسوں میں داخلہ لیتی ہیں اور بعض لڑکیاں تو پی ایچ ڈی تک کی ڈگری حاصل کر رہی ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ملک بھر کے اہم دینی مدارس کے نصابِ تعلیم کو مساوی درجہ تسلیم کرتے ہوئے ان کو مختلف کورسوں میں داخلوں کی سہولت فراہم کرائی ہے۔ ان میں یوپی کے عربی اور فارسی امتحان بورڈ، بہار مدرسہ بورڈ، ویسٹ بنگال مدرسہ بورڈ کے ساتھ ساتھ افضل العلوم عربک کالج کیرالا، باقیات الصالحات ویلور، دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم اہلِ سنت موبیٰ، دارالعلوم فلاح دارین سورت، جامعۃ الاسلامیہ ولساڑ، جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ، جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ، جامعہ مفتاح العلوم مئو، جامعہ قاسمیہ، جامعۃ السلفیہ وارانسی، جامعہ عمر آباد چنئی، مدرسہ عالیہ کولکتہ، مدرسہ عالیہ فتح پور، مدرسہ عالیہ رامپور، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ، مرکزی درسگاہِ اسلامی رامپور مدرسۃ العلوم، مدرسہ شاہی مرادآباد، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ، مظاہر العلوم سہارنپور، ناظمہ عربک کالج لکھنؤ، ندوۃ العلماء لکھنؤ، سلطان المدارس لکھنؤ خصوصی طور پر شامل ہیں۔ (75)

ہندوستان بھر میں مسلم لڑکیوں کے عصری تعلیمی اداروں میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے اور پچھلے دس برسوں میں لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کے اسکولوں اور کالجوں میں اضافہ ہوا ہے۔ اتر پردیش جیسی تعلیمی پسماندہ ریاست کے ایک ایک شہر میں کئی کئی لڑکیوں کے انٹر کالج اور ڈگری کالج تک قائم ہو رہے ہیں۔ ملک بھر کے 92 مسلم زیر انتظام ڈگری کالجوں کے ایک سروے سے پتہ چلتا ہے کہ آزادی سے قبل تک صرف چھ کالج مسلمانوں نے قائم کئے جبکہ 1972ء سے 1999ء کی مدت میں ان کی تعداد 46 ہوگئی۔ اور ایک اندازے کے مطابق 1999ء سے 2006ء تک ان کی تعداد میں پچاس سے زائد کا اضافہ ہوا ہے۔ ملک کی آزادی کے

وقت تک مسلمانوں میں مخلوط تعلیم سے پرہیز کیا جاتا تھا مگر آج مسلمانوں کے بدلتے ہوئے مزاج کا اندازہ مخلوط تعلیم سے لگایا جا سکتا ہے اور 1999ء تک پورے ملک میں 71.73 فیصد مسلم ڈگری کالج مخلوط تعلیم کے تھے جبکہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کے ڈگری کالجوں کی تعداد دوگنی سے زیادہ تھی۔ (76)

غرض کہ مسلم قائدین کو مسلمانوں کی زمینی حقیقتوں کا کوئی اندازہ نہیں ہے اور ہمارا پختہ نظریہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں تعلیمی بیداری کی لہر ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مرکزی اور ریاستی سرکاریں ان کو آئینِ ہند کی ضرورتوں کے مطابق ترقی کرنے کے مواقع فراہم کرائیں تاکہ وہ بھی ملک کی تعمیر و ترقی میں نمایاں حصہ لے سکیں اور ہندوستان کی سیکولر بنیادوں کو اور مضبوط کر سکیں جن پر اس ملک کی بقا منحصر ہے۔

عورتوں کو تعلیم کے مواقع فراہم کرانے اور انہیں باعزت زندگی گزارنے اور سماج میں برابر کا درجہ دلانے میں سماجی مصلحوں کی بھی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔ ان میں راجہ رام موہن رائے، پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر، کیشو چندر سین، سر سید احمد خاں، سوامی دیانند، جی۔ کے۔ دیودھر، سوامی وویکانند، مہارشی ڈی۔ کے۔ کاروے، نظام حیدرآباد، جسٹس بدرالدین طیب جی، جسٹس امیر علی، جسٹس کرامت حسین، شیخ محمد عبداللہ۔ جی۔ کے۔ گوکھلے، مہاتما پھولے، مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

6 / دسمبر 1992ء کو بابری مسجد کے انہدام کے بعد پورے ملک کے مسلمانوں میں ایک تعلیمی لہر پیدا ہوئی ہے اور خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ لڑکیوں کے نئے نئے جامعات قائم کئے جا رہے ہیں تاکہ صالح معاشرے کی تشکیل اور نئی نسل کی ذہنی و فکری تربیت اور ان کی کردار سازی میں عالمانہ کردار ادا کر سکیں۔ ان لڑکیوں کے دینی مدرسوں میں عصرِ حاضر کے تقاضوں کے تحت بقدر ضرورت علومِ عصریہ بھی نصاب میں شامل ہے۔ اس کے ساتھ علم امورِ خانہ داری، سلائی کڑھائی وغیرہ کو بھی نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ ان لڑکیوں کو جنرل نرسنگ، جنرل میڈیسن، میٹرنٹی اور دوسرے ضروری امور کی بھی تعلیم دی جائے۔ نئے قائم شدہ جامعات اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ جملہ جدید ٹیکنالوجیکل

سہولتوں سے لیس ہیں جن میں تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم اور کمپیوٹر ٹریننگ بھی شامل ہے۔ (77)

ہندوستان کے لڑکیوں کے بعض دینی مدارس میں تو دنیا بھر کی لڑکیاں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونے کے لئے آتی ہیں۔ خاص طور پر گجرات کے ضلع بلساڑ کے جامعہ اصلاح النسات میں فرانس، بہامہ، زامبیا، ویسٹ انڈیز، ساؤتھ امریکہ، امریکہ اور انگلینڈ تک کی لڑکیاں آتی ہیں۔ اسی طرح مہاراشٹر کے مالیگاؤں میں واقع جامعۃ الصالحات، جامعہ نگر میں ہندوستان کی تمام ریاستوں کے ساتھ ساتھ انگلستان، کینڈا اور امریکہ کی لڑکیاں بڑی تعداد میں داخل ہیں اور ان اداروں کو نہ صرف ملکی بلکہ عالمی شہرت تک حاصل ہے۔

☆☆

حواشی

1۔ روما چودھری: اسٹیٹس اینڈ رول آف ویمن۔ گریٹ انڈین ویمن تھرو دی ایجیز (1978ء) فرما کے ایل ایم پرائیوٹ لمیٹیڈ، کلکتہ

2۔ اے ایس الٹیکر: دی پوزیشن آف ویمن ان ہندو سویلائزیشن (1973ء) موتی لعل بنارسی داس، دلی۔

3۔ جے کے پلائی: ایمپروونگ ویمن ان انڈیا: نیورلس آف ایجوکیشن، یونیورسٹی نیوز جلد 28 شمارہ 27، ایسو سی ایشن آف انڈین یونیورسٹیز، نئی دلی

4۔ اے ایس الٹیکر: دی پوزیشن آف ویمن ان ہندو سویلائزیشن

5۔ بھول رینو گہا: ایجوکیشن آف ویمن ان انڈیا۔ اے ہسٹوریکل پرسپیکٹو 1969ء ایجوکیشن کواٹرلی۔ جلد 21 شمارہ 1

6۔ ایضاً

7۔ دیوی داس: انڈین ویمن تھرو دی ایجیز ان! ڈی کے وششٹ (ایڈیٹر) انسائکلوپیڈیا آف ویمن ان انڈیا (1976ء) پروین انسائیکلوپیڈیا پبلی کیشن، نئی دلّی

8۔ اندرا گاندھی: ''عورت! دھرم کی دنیا میں'' مذاہب عالم نمبر، سالنامہ گگن، بمبئی

9۔ عابدہ سمیع الدین: جنگِ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ

10۔ اے ایس الٹیکر: دی پوزیشن آف ویمن

11۔ شبانی رائے: اسٹیٹس آف مسلم ویمن ان نورتھ انڈیا (1979ء)، آر پبلشنگ کارپوریشن، دلّی

12۔ محمد اسلم جیراجپوری: خواتین، سنگم کتاب گھر، اردو بازار، دلّی

13۔ جے سی اگروال: انڈین ویمن۔ ایجوکیشن اینڈ اسٹیٹس، آریہ بک ڈپو، نئی دلّی

14۔ ایلا مکھرجی: سوشل اسٹیٹس آف نورتھ انڈین ویمن (1972ء) شیولعل اگروال اینڈ کمپنی، آگرہ

15۔ پروفیسر علی اشرف: تعارف۔ تہذیب الاخلاق تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، نفیس بانو، نشاط آفسیٹ

پریس، ٹانڈہ
16۔ دھرم پال: دی بیوٹی فل ٹری۔ صفحہ 12
17۔ پروفیسر شمیم نکہت: آزادئ نسواں کی جدوجہد۔ صفحہ 41۔ اردو میں لسانی ادب کا منظرنامہ۔ مرتبہ قیصر جہاں، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
18۔ طفیل احمد منگلوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل، کتب خانہ عزیزیہ، دلّی
19۔ بیرینگن ٹومس: بغاوتِ ہند اور ہماری آئندہ پالیسی
20۔ کلدیپ کور: دی ایجوکیشن ان انڈیا (1985-1781ء) سینٹر فار ریسرچ ان رورل اینڈ انڈسٹریل ڈیولپمنٹ، چنڈی گڑھ
21۔ مالک رام: قدیم دلّی کالج۔ صفحہ 18۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دلّی
22۔ جی این شرما: پولیٹکس اینڈ سوسائٹی، پرمال پرکاشن، اورنگ آباد
23۔ مالک رام: قدیم دلّی کالج۔ صفحہ 18 مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دلّی
24۔ ناہید قیصر توما: انٹرنیٹ (ایف ای ایجوکیشن) 19 / مارچ 2006ء
25۔ وی بی کوری شیٹی: فیمیل ایجوکیشن! اے اسٹڈی آف رورل انڈیا، کوسمو پبلی کیشنز، نئی دلّی
26۔ ناہید قیصر توما: ایجوکیشن فار ویمن
27۔ ایس این مکھرجی: ہسٹری آف ایجوکیشن آف انڈیا (1966ء) اچاریہ بک ڈپو، بڑودہ
28۔ ایم سی پال: کولونیلزم اینڈ ویمنز ایجوکیشن (1989ء) سوشل چینج جلد 19 شمارہ 2
29۔ رپورٹ نیشنل کمیٹی اون ویمنز ایجوکیشن 1959ء۔ وزارتِ تعلیم، حکومتِ ہند
30۔ ڈاکٹر معین عقیل: مسلمانوں کی جدوجہد آزادی، مکتبہ تعمیر انسانیت اردو بازار، لاہور
31۔ پی سی جوشی: انقلاب 1857ء۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، دلّی
32۔ ابوالاعلیٰ مودودی: تحریکِ آزادی ہند اور مسلمان۔ صفحہ 48 اسلامک پبلی کیشنز، لاہور
33۔ سر سید احمد خاں: اسبابِ بغاوتِ ہند۔ صفحہ 27، مفید عام آگرہ
34۔ ایضاً ایضاً
35۔ نیشنل کمیٹی اون ویمنز ایجوکیشن 1959ء

36۔ ایم سی پال: کولونیلزم اینڈ ویمنز ایجوکیشن

37۔ نیشنل کمیٹی اون ویمنز ایجوکیشن 1959ء وزارتِ تعلیم، حکومت ہند

38۔ سندھووی فاڈکے: ویمنز ایجوکیشن ان انڈیا۔ اے ہسٹوریکل پرسپیکٹو ایس این ڈی ٹی یونیورسٹی، بمبئی

39۔ جے سی اگروال: انڈین ویمن۔ ایجوکیشن اینڈ اسٹیٹس (1987ء) آریہ بک ڈپو، نئی دلی

40۔ رپورٹ نیشنل کمیٹی اون ویمن ایجوکیشن

41۔ عابد حسین: ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں۔ صفحہ 56۔ مکتبہ جامعہ، دلی 1965ء

42۔ ایم سی پال: کولونیلزم اینڈ ویمنز ایجوکیشن ان اندیا

43۔ رپورٹ نیشنل کمیٹی اون ویمن ایجوکیشن

44۔ قرۃ العین حیدر: شاہراہ حریر۔ صفحہ 150

45۔ آرتھر میہیو: فیمیل وائسیس۔ ویمنز رائٹرس ان حیدرآباد، گورنمنٹ سینٹرل پریس، حیدرآباد

46۔ مارگریٹ پرنو: نظام اینڈ خلافت موومینٹ، اکنومک اینڈ پولیٹیکل ویکلی

47۔ شیلا راج: میڈیوالزم ٹو ماڈرنزم، پاپولر پرکاشن، بمبئی

48۔ محب حسین: معلم نسواں (1886ء) فریڈم اسٹرگل ان حیدرآباد

49۔ شمیم نکہت: آزادیٔ نسواں کی جدوجہد

50۔ ڈاکٹر راحت ابرار: رنج میرٹھی۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

51۔ گیل مینول: دیباچہ۔ اے ویمن آف سبسٹینس، زبان نئی دلی

52۔ ہمایوں مرزا: میری کہانی۔ صفحہ 295۔ شمس مطبع، حیدرآباد 1939ء

53۔ ترنم ریاض: اردو میں تانیثی رجحان۔ صفحہ 83۔ اردو میں نسائی ادب کا منظرنامہ، مرتبہ قیصر جہاں۔ شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

54۔ مولانا اسلم جیراجپوری: ''خواتین'' (1951ء) سنگم کتاب گھر۔ اردو بازار۔ دلی

55۔ قرۃ العین حیدر: شاہراہِ حریر۔ صفحہ 160، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی

56۔ سونیا نشاط امین: دی ورلڈ آف مسلم ویمن ان کولونیل بنگال (1939-1876ء) ای جے بریل

57۔ زویا حسن و ریتو مینن: ایجوکیٹنگ مسلم گرلس، ویمنز ان لمیٹیڈ، حوض خاص، دلی

58۔ ایم سی پال: کولونیلزم اینڈ ویمنز ایجوکیشن ان انڈیا

59۔ ڈاکٹر نمیتا سنگھ: ہندی ادب میں خواتین کی خدمات، اردو میں لسانی ادب کا منظر نامہ۔ صفحہ 267۔ قیصر جہاں

60۔ ایس شری دیوی: اے سینچوری آف انڈین ویمن ہوڈ (1965ء) راؤر گھوپر، میسور

61۔ ڈاکٹر محمد مساعد: ایس این ڈی ٹی خواتین یونیورسٹی۔ صفحہ 38۔ انسٹیٹیوٹ آف پبلک اسٹڈیز، اسلام آباد

62۔ این زبیری: ضیائے حیات، کراچی (پاکستان)

63۔ ایم سی پال: کولونیلزم اینڈ ویمنز ایجوکیشن

64۔ رپورٹ نیشنل کمیٹی اون ویمنز ایجوکیشن

65۔ ایم سی پال: کولونیلزم اینڈ ویمنز ایجوکیشن

66۔ سید الطاف علی بریلوی: دی اسٹریگل آف مسلمس ان ایجوکیشن۔ صفحہ 77 مرتبہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس 1938ء

67۔ رپورٹ این سی ڈبلیو ای

68۔ ایم ڈی فلیچر: ریڈنگ رشدی۔ صفحہ 139 (1994ء) روڈوپی

69۔ قرۃ العین حیدر: شاہراہ حریر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

70۔ حمیدہ اختر حسین رائے پوری: ہم سفر۔ صفحہ 19-18، مکتبہ ڈانیال۔ عبداللہ ہارون روڈ کراچی

71۔ زویا حسن اور ریتو مینن: ایجوکیٹنگ مسلم گرلس

72۔ ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن: یونیورسٹی ایجوکیشن کمیٹی 49-1848ء

73۔ عرفان حبیب: ہندوستانی مسلمان حال اور مستقبل، ہندی ماہنامہ ہنس۔ اگست 2003ء

74۔ زویا حسن ایضاً صفحہ 16-15 ایضاً

75۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گائڈ ٹو ایڈمیشن 2007-2006ء۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

76۔ ڈائرکٹری آف مسلم مینیجڈ ڈگری کالجیز (1999ء) ادارہ فروغ تعلیم و ثقافت، مسلمانانِ ہند، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

77۔ ڈاکٹر قمر الدین: ہندوستان کی دینی درسگاہیں۔ صفحہ 258-257، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی۔ دلی 1996ء

باب پنجم

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیمِ نسواں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ کا جنسی تعصب سے ہٹ کر اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حیرت انگیز اور دلچسپ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لئے چندے کی فراہمی میں ہندوستان بھر کی خواتین نے مذہب اور علاقے کی تفریق کے بغیر دل کھول کر مدد کی مگر جب شیخ عبداللہ اور ان کی بیگم نے لڑکیوں کے لئے اسکول قائم کیا تو مردوں کی طرف سے شیخ صاحب کو سخت مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخی عمارتوں پر لگے کتبے اور علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے شماروں میں شائع عطیہ دہندگان کی فہرست اس بات کی خاموش گواہ ہے کہ مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کی بھی یہی کوشش تھی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اپنے پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ اس خواب کی تکمیل کے لئے خواتین نے نہ صرف مالی امداد فراہم کرائی بلکہ اپنے سونے کے زیور بھی لڑکوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے نذر کردئے۔

ان میں سے بہت سی عمارتیں سرسید کے دور میں مکمل بھی ہوگئی تھیں۔ جن خواتین کے نام اس یونیورسٹی کی تاریخی عمارتوں کے کتبوں پر درج ہیں ان میں ممتاز جہاں نصر اللہ بیگم رئیسہ بمبئی، مسماۃ کفایت النساءٔ بیگم (مرحومہ) رئیس سلیم پور، ہرہائی نیس شریمتی ولیا رانی نوسر مائی رئیسہ قاسم باڑہ، حفیظ النساءٔ نذیر بیگم اہلیہ منشی نذیر علی لکھنؤ، مشرف جہاں محمودہ بیگم رئیسہ دلی، سید النساءٔ اقبال علی بیگم رئیسہ رائے بریلی، نور جہاں مہدی علی بیگم رئیسہ اٹاوہ، نواب خیر النساءٔ بیگم رئیسہ

کرناٹک، بنت ایل این اسٹریچی، مہارانی ہربنس کور رئیسہ تلوئی اودھ۔ اس کے ساتھ ہی ایم اے او کالج کی باؤنڈری وال پر بھی بہت سے عطیہ دہندگان کے نام کندہ ہیں۔ ایک تاریخی کتاب میں اس جالی نما باؤنڈری کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ ''یہ احاطہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ تھامے ہوئے اس کالج کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں کہ کوئی آفت اس پر نہ آنے پائے''۔ ہاتھ سے ہاتھ پکڑنے والوں میں بعض خواتین کے نام بھی شامل ہیں ان میں ناظم النساءٔ بیگم ناظر حسین، وہاج النساءٔ صاحبہ بنت ناظر الدین، طاہر النساءٔ بانو زوجہ محمد نظام الدین، بیگم ڈپٹی نذیر احمد اور بیگم مولوی ذکا اللہ خاں شامل ہیں۔

انسٹیٹیوٹ گزٹ کے 30/مارچ 1886ء کے شمارے میں سرسید احمد خاں عطیہ دہندگان خواتین کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''ہم کو ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ ہندوستانی عورتوں کا نام بھی مدرسۃ العلوم کی امداد میں شامل ہو جس سے اس بات کا ثبوت حاصل ہو کہ ہندوستان کی عورتیں بھی تعلیم کی قدر کرتی ہیں۔

ہمارے مدرسۃ العلوم کی مددگار عورتوں میں سب سے اول مہارانی سرنامی قاسم بازار کا نام نامی ثبت ہے جنہوں نے اپنی فیاضی اور ہر ایک رفاہِ عام کے کام میں مدد دینے سے اپنے نام کو تمام ہندوستان میں قابلِ ادب اور آفتاب سے زیادہ فیض بخش ثابت کیا ہے مگر اب ہم دوسری مہارانی صاحبہ کا بھی نام بتاتے ہیں جنہوں نے سینٹرل ہال میں پانچ سو روپیہ کا چندہ تعلیم دینے سے بہت بڑے کام میں مدد دی ہے۔ یعنی مہارانی ہربنس کور صاحبہ راجہ سرپال سنگھ بہادر والی تلوئی۔ ہم دل سے مہارانی صاحبہ کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ جب مہارانی صاحبہ کا نام سینٹرل ہال میں کندہ ہوگا تو ہر شخص نہایت ادب سے اس کو پڑھے گا اور ہماری قوم کے لئے وہ باعثِ احسان ہوگا۔'' (1)

والئ مرشد آباد (بنگال) ہر ہائی نیس نواب شمس الجہاں بیگم صاحبہ کے اعزاز میں 9/دسمبر 1901ء کو ایم اے او کالج، علی گڑھ میں ایک استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا گیا اور ایک سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے کہا گیا کہ ''ہماری قوم کی خواتین والا تمکین میں سے ایک ایسی رئیسہ نے کالج کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے معزز فرمایا جو اس وقت بہ لحاظ اپنے درجہ اور شان اور عزت اور

دو دمان کے ہماری قوم کی سرتاج اور ساری پریسیڈینسی بنگال میں ممتاز ہیں اور جو نہ صرف اپنے درجہ اور خاندانی مرتبہ کے لحاظ سے واجب الاحترام ہیں بلکہ بہ سبب اس ہمدردی اور خیال کے جو آپ کو اپنی قوم کے بچوں کے ساتھ عموماً اور اپنی قوم کی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے خصوصاً ہی بے نظیر اور عدیم المثال ہے...... سر سید احمد خاں میموریل فنڈ کے لئے جو مدد آپ نے کی اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ جب کلکتہ میں ہوا تھا اس کی شاہانہ میزبانی اور سرپرستی جو جنابِ عالیہ نے فرمائی اسے ہم کبھی بھول نہیں سکتے۔''

اس استقبالیہ کے جواب میں نواب شمس الجہاں بیگم نے تعلیمِ نسواں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ''مجھ کو در حقیقیت اپنی قوم کی لڑکیوں کی تعلیم کا خیال زیادہ تر خاص کر اس وجہ سے ہے اس کی طرف بہت کم اشخاص توجہ کرتے ہیں ورنہ میں اپنی قوم کے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کی تعلیم کے ساتھ یکساں دلچسپی رکھتی ہوں۔ (ایڈریسیز اینڈ اسپیچیز ایم اے او کالج۔ 1919 - 1875 صفحہ 152، ابوالحسن)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخی عمارتوں کے کتبوں کے علاوہ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے مختلف شماروں میں بے شمار خواتین عطیہ دہندگان کے نام معہ ان کی رقومات کے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے بہت سی ایسی خواتین بھی شامل ہیں جو معاشی طور پر انتہائی پسماندہ تھیں اور انہوں نے چپاتی دے کر اپنی وابستگی کا اظہار کیا۔ ان چپاتیوں کو بھرے جلسہ میں فروخت کیا جاتا تھا اور اس رقم کو کالج فنڈ میں لگایا جاتا تھا۔ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے 15 مئی 1912ء کے شمارے سے پتہ چلتا ہے کہ کالج میں ایک باقاعدہ ''زنانہ فنڈ'' بھی جسٹس محمود کی بیوہ کی سربراہی میں قائم ہوا۔ جن معزز خواتین نے چندہ دیا ان میں لیڈی آسمان جاہ، بیگم میاں شاہ دین، پاکستان کے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی والدہ بیگم میاں شاہنواز بھٹو کے علاوہ اللہ بی بی (کان کی بالی) کرن بی بی (انگوٹھی) مائی اللہ رکھی (انگوٹھی) اور نواب بیگم (آٹا) کے نام درج ہیں۔ (2)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تحریک سے مسلم خواتین کی دلچسپی ایک مبارک فال تھی۔ مسلم تعلیم یافتہ خواتین نے جگہ جگہ تعلیمی فنڈ قائم کئے۔ ایسا ہی ایک جلسہ مسز خدیو جنگ کے دولت کدہ پر منعقد ہوا جس میں حیدر آباد کی اکثر معزز خواتین شریک تھیں۔ معزز میزبان نے اس موقعہ پر جو موثر

اور دل پذیر تقریر فرمائی تھی جو "الناظر" کے جولائی 1911ء میں شائع ہوئی تھی اور اس کی نقل خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے "تعلیمی ادارے" کے عنوان سے شائع کتاب میں درج کی ہے۔

"محمڈن یونیورسٹی کے قائم کرنے کی طرف آج کل کُل روسائے اسلام کا رجحان ہے اور کُل ہندوستان نے اس کارِ خیر میں حتی الامکان مدد دی ہے۔ حیدر آباد جو مسلمانوں کا اصل مرکز اور دارالسلطنت ضرور ہے کہ اس کام میں جو خاص مسلمانوں کے فائدے کے لئے ہے سب سے بڑھ کر رہے.....پس ایسی حالت میں ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جو کچھ جس سے ہو سکے اس کارِ خیر میں مدد کرے اور سب سے بڑھ کر ہماری قوم کی ماں، بہنوں اور معزز خواتین کا یہ فرض ہے کہ اپنی قوم کی مدد کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں......

اس مہینہ کے شریف بی بی کے پرچے میں میں نے دیکھا کہ اکثر غریب بی بیوں نے جنہیں اپنی قوم کا درد ہے اور جن کے پاس کچھ اور نقد نہ تھا، اپنا زیور اتار کر اس کارِ خیر کے لئے بھیج دیا۔

کل خواتین حیدر آباد سے استدعا ہے کہ آپ اس کام میں مدد کریں تا کہ ہندوستان کو ہماری معزز مستورات کی سخاوت اور ہماری ہمدردی کا حال معلوم ہو جائے اور حیدر آباد ہندوستان کے کل ممالک میں اس کارِ خیر میں سب سے بڑھ چڑھ کر رہے۔" (3)

جب کہ اس کے برخلاف جب لڑکیوں کا اسکول شروع کیا گیا تو اس اسکول کو ایم اے او کالج کی صحت کے لئے مضر خیال کیا گیا۔ لڑکیوں کی تعلیم کی مخالفت کرنے والوں میں علماء ہی شامل نہیں تھے بلکہ ایم اے او کالج کے پرنسپل مسٹر آرچبولڈ بھی شامل تھے جو خود لندن کے تعلیم یافتہ تھے۔

شیخ صاحب کہتے ہیں کہ جب وہ ایم اے او کالج کے طالب علم تھے تبھی "یہ خیال ضرور آتا تھا کہ عورتیں زیادہ تر جاہل ہوتی ہیں اسی وجہ سے وہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتیں۔ لیکن میرے بزرگ دوستوں میں سے کسی کو میں نے لڑکیوں کی تعلیم کا حامی نہ دیکھا۔ مولانا سید کرامت حسین البتہ جو علی گڑھ میں لاء کے پروفیسر تھے اور جن سے میں نے قانون پڑھا تھا وہ تعلیمِ نسواں کے حامی تھے۔ ان کے علاوہ میرے عزیز دوست مرحوم خواجہ غلام الثقلین بھی تعلیم نسواں کے حامی تھے اور میں نے سنا تھا کہ سید امیر علی جج کلکتہ ہائی کورٹ اور بدرالدین طیب جی جج بمبئی ہائی کورٹ تعلیمِ نسواں کے بہت حامی تھے لیکن کہیں پر اس وقت تک کوئی مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لئے

مدرسہ جاری نہیں ہوا تھا۔'' (4)

شیخ عبداللہ نے 1904ء میں جب علی گڑھ سے تعلیم نسواں کی تحریک میں جان ڈالنے کے لئے رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا اس وقت سید سجاد حیدر صاحب، خان بہادر سید ابو محمد، مولوی احتشام الدین اور مولوی انعام الحق نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور تجویز کیا تھا کہ رسالہ کا نام ''خاتون'' رکھا جائے۔ شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ ''اس وقت جو کچھ لکھا جاتا تھا ہاتھ پاؤں بچا کر لکھا جاتا تھا۔ پھونک پھونک کر قدم رکھے جاتے تھے۔ ہمارے رستے میں کانٹے تھے، غار تھے، ناہموار زمین تھی اور بعض منزلیں سخت دشوار گذار تھیں۔ بایں ہمہ ہم کو فرقۂ نسواں کی ترقی، بہبودی و تعلیم کے لئے لڑائی کا سامان مہیا کرنے کو ایک میگزین تیار کرنے کی سب سے پہلے فکر کی اور خدا نے اس میں ہماری دست گیری کی اور اس میگزین کے گولا بارود نے اس بڑی مہم کے سر کرنے میں جو ہمارے سامنے تھی، ہم کو بہت مدد دی۔'' (5)

شیخ عبداللہ نے جب ''خاتون'' رسالہ شروع کیا تو اس کے ساتھ ساتھ مختلف اخبارات و رسائل میں مخالفت بھی شروع ہوگئی۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ رسالہ نیچری رسالہ ہے اور پردہ کی مخالفت کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ ایک صاحب نے جو مولویت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ علی گڑھ سے جو اخبار یا رسالہ نکلے گا وہ مذہبی اعتقادات کے مخالف ہی ثابت ہوگا۔ سر سید احمد خاں نے تو بذریعہ مردوں کے اسلام کی بیخ کنی کا بیڑا اٹھایا تھا، اب اس کا ایک شاگرد بذریعہ عورتوں کے اسلام کو مٹانے کی فکر میں ہے۔

ان مضامین کی مخالفت کا نواب محسن الملک مرحوم پر بھی اثر ہوا اور کہا کہ اس رسالہ سے علی گڑھ تحریک کو کہیں نقصان نہ پہنچ جائے جس پر شیخ صاحب نے جواب دیا کہ ''علی گڑھ کی تحریک کوئی موم کی ناک نہیں ہے کہ چھونے سے ٹیڑھی ہو جائے'' اگر ایسا ہو تو پھر اس کا خدا حافظ ہے۔ انہوں نے کہا کہ لڑکیوں کی تعلیم تو ایسی چیز ہے کہ اس کی مخالفت تھوڑے دنوں کے بعد بہ منزلہ قومی خودکشی کے سمجھی جانے لگے گی۔ اس لئے مناسب نہیں کہ علی گڑھ میں اس کی مخالفت ہو۔ نواب صاحب خود بھی نہایت روشن خیال اور معقول پسند تھے اس لئے انہوں نے اس کے بعد کوئی مخالفت نہیں کی بلکہ رسالہ کے لئے ایک مضمون بھی شائع کرنے کو دے دیا۔ (6)

شیخ محمد عبداللہ نے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس کا نقشہ جب ایم اے او کالج کے سکریٹری نواب وقار الملک اور دیگر ممبران کے سامنے پیش کیا تو لوگوں نے بہت کچھ مین میخ نکالی۔ کسی نے کہا کہ ''دیواروں پر سے لوگ پرزے لکھ لکھ کر پھینکیں گے'' اور کوئی کہتا تھا کہ ''کمرے کے روشن دان جو باہر کی طرف رکھے گئے ہیں، قطعی نہیں ہونے چاہئیں'' شیخ صاحب نے سب سے کہہ دیا کہ بورڈنگ ہاؤس ایسا ہی بنے گا جیسا کہ شرفأ کے رہنے کے لئے مکان ہوا کرتے ہیں۔ یہ سن کر سب خاموش ہو گئے اور جب بورڈنگ ہاؤس تیار ہو گیا تو پھر سب نے آکر دیکھا اور کہا کہ ''ہاں پردے کا انتظام تو ہے مگر ویسا نہیں ہے جیسا کہ شیخ صاحب نے کہا تھا۔''

پردے کے نظام کو یقینی بنانے کے لئے شیخ عبداللہ کے ایک حامی خلیفہ محمد حسین نے اسکول کے اندرونی حصہ میں ایک ملحقہ بورڈنگ ہاؤس قائم کرنے کی وکالت کی۔ انہوں نے لوگوں کو یقین دلایا کہ بچیوں کی سرپرستی ذمہ دار افراد کے ذریعہ ان کی نگرانی میں معمر خواتین کے ذریعہ کی جائے گی اور معلمات اسکول کی چہار دیواری میں ہی طالبات کے ساتھ رہیں گی۔ لڑکیوں کے لئے بیڈمنٹن، بلیرڈ اور دیگر مناسب کھیلوں کے لئے سہولیات فراہم کی جائیں گی۔ نصابِ تعلیم قوم کے دانش مند افراد کے ذریعہ تیار کرایا جائے گا جس میں دینی تعلیم، اخلاقی تربیت، بچے کی پرورش، امورِ خانہ داری اور ابتدائی ریاضی کو بھی شامل کیا جائے گا۔ ہوسٹل کے احاطے میں ملاقات کا ایک کمرہ تعمیر کیا جائے گا تاکہ بچیاں صرف انہیں لوگوں سے مل سکیں جن سے ملاقات کی انہیں اجازت حاصل ہو۔ (7)

پروفیسر اصغر عباس پردے کے بارے میں مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ سرسید کی طرح ان کے رفقأ میں خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی ذکاءُ اللہ خاں، محسن الملک، ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ شبلی نعمانی بھی مروجہ پردہ کو مستحسن سمجھتے تھے جبکہ مولوی چراغ علی، عبدالحلیم شرر اور سید ممتاز علی مروجہ پردے کے خلاف تھے۔ چراغ علی کا خیال ہے کہ شریعت موسوی اور عہد نامہ جدید نے عورتوں کی سماجی اور اخلاقی سربلندی کے لئے کچھ نہیں کیا۔ اس کے برعکس اسلام نے عورت کے ساتھ احترام کا سلوک کیا ہے۔ عبدالحلیم شرر ''سرسید کی دینوی برکتیں'' کے عنوان سے رسالہ لکھ چکے تھے۔ انہوں نے اپنے جرائد مہذب پردۂ عصمت اور سیر نسواں کے ذریعہ مسلمان خواتین

کے سماجی مسائل پر نہایت جرأت اور صاف گوئی سے بحث کی ہے اور ان کی بحثوں کا سرچشمہ قرآن وحدیث ہے۔ پردہ کے بارے میں سید ممتاز علی کا خیال ہے کہ عورتوں کو پردہ میں رکھنا مذہباً درست نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب حقوق نسواں میں لکھا ہے کہ وہ اس رسم کو قانونِ فطرت کے خلاف ہی نہیں مذہب کے خلاف بھی سمجھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سرسید اور ان کے رفقاً کے مضامین کے ذریعہ مختلف جرائد اور صحائف کے روشن صفحات پر نسائی تحریک ایک زوردار قوت کی شکل میں ابھری اور ہندوستان میں عظمتِ نسواں کی سمت وراہ میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی اور رفتہ رفتہ پردہ کی آہنی دیوار کی شکستگی دیدنی ہوتی گئی۔ (8) مشہور شاعر اکبر الہ آبادی کو کہنا پڑا

پردہ کا مخالف جو سنا بول اٹھیں بیگم
اللہ کی مار اس پہ علی گڑھ کے حوالے

1899ء میں علی گڑھ کے ایک روشن خیال طالب علم سجاد حیدر یلدرم انیس سالہ انڈر گریجویٹ نے رسالہ معارف میں ایک مضمون لکھا ''آج کل کا نوجوان شادی سے پہلے یہ پرلطف خواب دیکھتا ہے کہ اس کی شریک حیات اس کے برابر تعلیم یافتہ ہو، سلف رسپکٹ کے معنی اچھی طرح جانتی ہو، وہ یہ جانتی ہو کہ خاوند اس کی عزت کرے گا اور وہ خاوند کی۔ آج کل اور گذشتہ زمانہ کی عورتوں کی حالت تو بالکل یکساں ہے مگر مردوں کی حالت میں بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ گذشتہ زمانے کے مرد خود تعلیم یافتہ ہوتے تھے لیکن اپنی بیویوں سے تعلیم یافتہ ہونے کی توقع نہیں رکھتے تھے۔

آج کل کا نوجوان اپنی بیوی کو ایسی دماغی اور علمی سطح پر دیکھنا چاہتا ہے جس پر وہ خود ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوان اپنی بیوی کو اپنا ہم خیال کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی دو ترکیبیں ہیں ایک تو یہ کہ عورتوں کو ان ہی کی طرح تعلیم دی جائے اور وہ اس درجہ پر پہنچادی جائیں جس پر کہ آج کل کے مرد ہیں یا دوسری ترکیب یہ ہے کہ مردوں سے تعلیم چھین لی جائے اور وہ اس درجے پر لا ڈالے جائیں جس پر کہ اس وقت عورتیں ہیں کیونکہ اتحاد خیال ان ہی دو ترکیبوں سے ممکن ہے۔ بعض نوجوان اس وقت تک شادی کرنا گناہ سمجھتے ہیں جب تک کہ انہیں کسی سے عشق نہ ہو اور وہ عشق دوسری جانب سے قبول بھی کیا جائے۔ اس کے لئے بے پردگی کی ضرورت ہے، جو علیحدہ بحث ہے'' (9)

علی گڑھ کے زنانہ اسکول کا سماجی پس منظر بیان کرتے ہوئے بیگم ساجدہ زبیر کا کہنا

ہے کہ جب یہ چھوٹا سا اسکول نئی عمارت کے تعمیر ہوتے ہی یہاں منتقل ہوگیا تو دوری کی وجہ سے شہر کی شیخ زادیوں نے تو پڑھنا ترک کر دیا مگر یونیورسٹی کے علاقے اور دیگر شہروں سے کافی طالبات نے اس مدرسہ میں داخلہ لے لیا اور یہیں رہنا شروع کر دیا۔ وحید یہ ہاسٹل میں بورڈنگ ہاؤس بھی تھا اور کلاسیں بھی ہوتی تھیں۔ اساتذہ کی رہائش بھی اسی عمارت کے ایک حصہ میں تھی اور اسی عمارت کے دو کمروں کو اعلیٰ بی اپنے استعمال میں لاتیں۔ جو ذرا بڑا کمرہ تھا اس میں چاندنیوں کا فرش ہوتا۔ جو بیگمات اعلیٰ بی سے ملنے، اسکول کے متعلق معلومات حاصل کرنے یا اپنی لڑکی کے داخلے کے لئے آتیں ان کو فرش و چاندنی کے کمرے میں بٹھایا جاتا۔ گویا یہ کمرہ اعلیٰ بی کے دفتر کا کام انجام دیتا تھا اور Reception روم بھی تھا۔ اکثر اوقات ہماری سلائی کی کلاس بھی یہیں ہوتی۔ اعلیٰ بی ہمیں کپڑوں کی کتر بونت بھی سکھاتی تھیں۔ اعلیٰ بی کی تین بھانجیاں اور اپنی دو لڑکیاں ہاسٹل میں رہتی تھیں۔ وہ اپنے مقررہ کمروں میں رہتیں اور اعلیٰ بی کے کمرے میں ضرورتاً ہی آتیں۔ قائدے قانون کی پابندی ان پر بھی ایسی ہی لاگو ہوتی جیسی کہ دیگر طالبات پر ہوتی تھی۔

اس زمانے میں مسلم خواتین میں تعلیم یافتہ خواتین کی تعداد بہت کم تھی۔ بمشکل تمام ایک عیسائی ہیڈ مسٹریس مس مکلّف اور تین اور عیسائی استانیاں ملیں۔ ان اساتذہ کے اخلاق اور اسکول کے نظم و ضبط کو دیکھ کر بیگمات بہت متاثر ہوئیں، اعتماد قائم ہوا تو طالبات کی تعداد بڑھتی گئی اور مدرسہ ترقی کرتا گیا۔

مدرسہ کی شہرت ہوئی تو علی گڑھ کے رؤساء اور اکابرین کا اعتماد بھی حاصل ہوا......
شروانی خاندان میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج ایک حد تک تھا۔ چنانچہ خود موسیٰ خاں صاحب کی صاحبزادی راحلہ خاتون شروانیہ پڑھی لکھی خاتون تھیں، عربی اور فارسی پڑھی تھی، حدیث اور فقہ بھی پڑھا تھا۔ کراچی منتقل ہونے کے بعد ناظم آباد علاقہ میں سرسید گرلس کالج کے قیام میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

نواب مزمل اللہ خاں صاحب خود اپنے علم و فضل کے لئے مشہور تھے اور مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ ان کی بیٹی زاہدہ خاتون شروانیہ نہ صرف پڑھی لکھی خاتون تھیں بلکہ بڑی اچھی شاعرہ بھی تھیں۔ ان کا کلام ز۔ خ۔ ش کے نام سے اکثر رسالوں میں چھپتا رہا اور ان کی

جواں عمری کی موت کے بعد دیوان کی صورت میں یکجا کر کے چھاپا بھی گیا۔

علاوہ ازیں جناب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ بڑے علم نواز، حق شناس اور عالم بزرگ تھے۔ ان کے صاحبزادے الحاج عبید الرحمٰن خاں شروانی نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا ذاتی کلکشن مولانا آزاد لائبریری کو پیش کیا جو حبیب گنج کلیکشن کہلاتا ہے۔ اس خاندان نے ہمیشہ تعلیمِ نسواں کی حمایت کی اور شیخ صاحب کی ہمت افزائی فرمائی۔ مولوی حبیب الرحمٰن شروانی کی اہلیہ بیگم نفیس دلہن لیڈیز کانفرنس کی صدر رہ چکی تھیں۔

نواب صاحب چھتاری کے یہاں شروع میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہ تھا مگر بعد میں نواب احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری کی چھوٹی لڑکی تزئین نے مدرسہ میں داخلہ لیا اور تعلیم حاصل کی۔ تسنیم سلیم چھتاری اپنے زمانے کی بے حد مشہور اور معتبر افسانہ نگار تھیں۔ علاوہ ازیں ان کی کئی نواسیوں نے بھی مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ خواجہ فیملی کی اکثر خواتین اسکول کے جلسوں اور پارٹیوں میں شرکت کرتیں۔ عبدالمجید خواجہ پاپا میاں کے دوستوں میں سے تھے اور تعلیمِ نسواں کے مشن سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ان کے خاندان کی تقریباً سب ہی لڑکیوں نے اس مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ عبدالمجید خواجہ کی بیگم خورشید خواجہ کے والد حمید اللہ خاں مولوی سمیع اللہ خاں کے فرزند تھے اور مدرسۃ العلوم کے پہلے طالب علم تھے۔ حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں وہ مسز سروجنی نائیڈو کے افکار و خیالات سے خصوصی طور پر متاثر ہوئیں۔ (10)

خورشید بیگم 1920ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی ممبر بنیں اور تاحیات اسے برقرار رکھا۔ 1921ء میں وہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کی سبجیکٹ کمیٹی میں یو پی کی نمائندہ تھیں۔ انہوں نے علی گڑھ میں ایک کھادی بھنڈار بھی قائم کیا اور 1921ء میں علی گڑھ سے ہی ''ہند'' نام کا ایک ماہانہ جریدہ بھی شروع کیا جس کی ادارت کے فرائض بھی انہوں نے خود ہی انجام دئے۔ ایک پوسٹ کارڈ میں گاندھی جی نے انہیں لکھا تھا کہ وہ انہیں اردو میں اپنا سب سے پہلا خط لکھ رہے ہیں۔ (11)

عبدالمجید خواجہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانی وائس چانسلر تھے۔ خواجہ صاحب کی گرفتاری پر ان کی بیگم وائس چانسلر کا کام کاج بھی دیکھتی تھیں۔ 1930ء میں انہوں نے الہ آباد میں اپنے والد مرحوم کے نام پر حمیدیہ گرلس سیکنڈری اسکول قائم کیا جو بعد میں ہائی اسکول، پھر انٹر کالج اور

اب ڈگری کالج ہے۔(12)

خواجہ خاندان کی جمیلہ آپا جو بیگم جمیلہ مجیب کہلاتیں، علی گڑھ کی مشہور خاتون تھیں۔ انہوں نے بھی اس ادارے سے بی اے پاس کیا۔ بعدازاں ٹریننگ کالج سے بی ٹی کیا۔ ان کے شوہر پروفیسر مجیب صاحب ٹریننگ کالج میں پروفیسر تھے۔

شہر، یونیورسٹی اور سول لائنس کی دیگر خواتین بھی اکثر اسکول آتیں اور سالانہ جلسہ میں تو بہت ذوق وشوق سے شرکت کرتیں۔ ڈاکٹر بٹ صاحب کی بیگم، نور منزل کی بیگم نور الحسن اور بچن بابو کی بیگم اور بیٹی سوشیلا ٹنڈن سے اعلیٰ بی کے خاص تعلقات تھے۔ ان سب کی لڑکیوں نے اس اسکول ہی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ سریندر رکمار کی بیٹی کسم انسل بھی اسی کالج کی پروردہ ہیں۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہی تحریکِ آزادی کا آغاز ہو گیا تھا۔ 1920ء کے بعد سے سیاسی سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں اور ہندو مسلم خواتین نے بھی سیاست کے میدان میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ جگہ جگہ جلسے ہوتے، دھواں دار تقریریں کی جاتیں، بدیسی سامان کا بائیکاٹ کیا گیا اور کھدر اور چپل پہننے کا رواج عام ہو گیا۔ لڑکیوں کا یہ اسکول بھی اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ زنانہ جلسہ وحیدیہ ہاسٹل کے ہال کمرے میں ہوتے تھے۔

بیگم ساجدہ زبیر لکھتی ہیں کہ رام پور سے علی برادران کی والدہ بی اماں، عطیہ فیضی اور ان کی ہمشیرہ حیدرآباد سے مسز سروجنی نائیڈو جو بلبلِ ہند کے نام سے مشہور تھیں، انہیں بولتے سنا اور دیکھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہمارے کانوں نے سیاست اور Non Cooperation، سائمن کمیشن، ہوم رول، کانگریس اور بعد میں مسلم لیگ اور پاکستان کے نام سنے اور عملی حصہ لیا۔

1922-23ء کا ذکر ہے کہ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی نے علی گڑھ کے فعال لیڈران کی مدد سے خواتین کا ایک جلسہ منعقد کیا اس میں امیر وغریب سب ہی عورتوں کو خطاب کیا۔ میں نے بھی چند دیگر لڑکیوں کے ساتھ اعلیٰ بی کی ہمراہی میں اس جلسہ میں شرکت کی۔ شہر کے ایک محلہ قاضی پاڑہ (جہاں اب سٹی گرلس ہائی اسکول قائم ہے) میں شامیانے لگا کر پنڈال بنا دیا گیا تھا۔ پنڈال میں مرد صاحبان تھے اور برابر کے خیمے میں عورتوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ کئی ایک نے تقریریں کیں مگر سب سے زیادہ ہم لوگ علی برادران کی جادو بیانی سے متاثر ہوئے۔

متعدد خواتین نے چندہ دیا۔ ایک عورت نے جو ہمارے پاس بیٹھی ہوئی تھی اٹھ کھڑی ہوئی اس نے اپنے کانوں کی بالیاں اتاریں اور ہتھیلی پر رکھ کر ہاتھ مولانا شوکت علی کی طرف بڑھا دیا اور بولی میاں پیسہ تو ہم غریبوں کے پاس کہاں ہے، یہ میرے کانوں کی بالیاں ہیں انہیں بیچ کر چندے میں ملا دینا۔ اندر اور باہر سناٹا چھا گیا۔ مولانا نے اس کے ہاتھ سے بالیاں لے لیں اور سب نے واہ واہ کے نعرے لگائے۔

اس کے بعد پردے کے ساتھ یعنی برقعہ اوڑھ کر اسکول کی لڑکیوں کو یونیورسٹی کے سالانہ جلسوں یعنی مباحثوں، مشاعروں اور تقاریری مقابلوں میں شرکت کی اجازت ملنے لگی۔ آٹھ دس لڑکیوں کی ٹولی ایک یا دو استانیوں کی ہمراہی میں اسٹریچی ہال جاتی اور زینے سے اوپر گیلری میں جا کر بیٹھ جاتی۔ گیلری سے نیچے ہال کی سب کارروائی بخوبی سنائی اور دکھائی دیتی تھی۔ چند لڑکوں کی زینے پر ڈیوٹی لگتی تھی تاکہ وہ کسی لڑکے یا غیر متعلق شخص کو اوپر جانے سے روکیں۔ ہمارے ساتھ دو ایک ملازم بھی ہوتے تھے جو نیچے رہ کر سواریوں کی نگرانی کرتے۔ یہ جلسہ تعلیمی حیثیت سے بڑے اہم ہوتے۔

مہاتما گاندھی، محمد علی جناح، پنڈت جواہر لعل نہرو، علامہ اقبال، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، حسن عطا شاہ اور بہت سے یادگار زمانہ لوگوں کو یونیورسٹی کے جلسوں میں دیکھا تھا اور ان کے جواہر پارے سنے تھے۔ احسان دانش، شکیل بدایونی، مجاز، جگر مرادآبادی، بہزاد لکھنوی، قمر جلال آبادی کی نظمیں، غزلیں اور نعتیہ کلام بھی انہیں محفلوں میں سننے کی سعادت نصیب ہوئی۔ (13)

اردو کی ممتاز ادیبہ عصمت چغتائی کا شمار گرلس اسکول کی مایہ ناز طالبات میں کیا جاتا ہے۔ انہوں نے پاپا میاں اور اعلیٰ بی کو بہت قریب سے دیکھا۔ شیخ صاحب کی بڑی بیٹی رشید جہاں جو خود ترقی پسند ادیبہ تھیں وہ علی گڑھ میں ان کی آئیڈیل تھیں۔ علی گڑھ میں پاپا میاں، ان کی بیگم اعلیٰ بی اور بیٹی ڈاکٹر رشید جہاں مسلمانوں میں تعلیم نسواں کے علمبردار تھے۔ ان کے یہاں جن لڑکیوں کو پناہ ملتی تھی وہ کیسی بپتاؤں سے گزر کر آتی تھیں، ان کا دل دہلا دینے والا بیان عصمت نے کیا ہے۔ دراصل عورتوں سے ناانصافیوں، ان پر ظلم اور ان کی دردشاؤں کے ایسے ایسے

واقعات عصمت نے بیان کئے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عصمت کے یہاں بغاوت جدید تعلیم کا عطیہ تھی۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ بغاوت کی یہ چنگاری ظلم و جبر کی اس سنگ باری سے پھوٹی تھی جس کا ہدف ہندوستانی عورت تھی۔ (14)

عصمت چغتائی نے نویں کلاس میں اس اسکول میں داخلہ لیا۔ انہوں نے اپنی نامکمل سوانح حیات ''کاغذی ہے پیرہن'' میں اپنی مادرِ درسگاہ کا بڑے دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ ''اردو پردے کے پیچھے بیٹھ کر ماسٹر مبارک علی سے پڑھتے تھے۔ انہیں پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون لڑکی پڑھ رہی ہے۔ اس لئے ان کی کلاس میں مشکل مضامین رٹا کرتے تھے۔ زیادہ وقت سعادت ہی دھیان سے پڑھتی اور سمجھتی تھی۔ کلاس میں میرے علاوہ سعادت، زہرہ بٹ، محمودہ عمر اور مونا پیرسن اور شاید سعیدہ عمر الدین کل چھ لڑکیاں تھیں۔''

بورڈنگ کی زندگی انتہائی محدود مگر زندہ دل انسان کے لئے تو پتھر میں بھی پھول کھلنے لگتے ہیں۔ میں ہر ہنگامے میں جوش و خروش سے حصہ لیتی۔ بہت سی دوست تھیں تو بہتوں سے لڑائیاں بھی ہوتیں، گیمس اب میرے قابو میں آچکے تھے اور ہر گیم میں حصہ لیتی تھی۔۔ ایف اے کی لڑکیاں ان خاص کمروں میں رہتی تھیں جو ڈرائنگ روم کے قریب تھے۔ کمروں کے پیچھے غسل خانے بھی تھے۔ بجلی اب بھی نہیں آئی تھی اور لالٹین جلتی تھی۔ پلنگ ہر لڑکی کو اپنے یہاں سے لانا پڑتا تھا۔

ممتاز عبداللہ ہمیں ہسٹری پڑھاتی تھیں۔ کافی کم عمر اور انداز سے بے حد نروس تھیں اس لئے بے حد رعب جماتی تھیں۔ ان سے لڑکیاں بے حد خائف تھیں۔ میں بھی خاصی ڈرتی تھی اور اپنی خصلت کے مطابق جس سے ڈرتی تھی اس سے کافی بدظن ہو جاتی تھی۔ مجھے رعب جمانے والوں سے بغض تھا۔ ان سے مختلف ان کی بڑی بہن خاتون عبداللہ پر جان جاتی تھی۔ بے حد نرم گفتار، ہمیشہ مسکرا کر بات کرتیں، کسی لڑکی کو ڈانٹنا ہوتا تو بے حد گھبراتیں، ڈانٹتے ڈانٹتے انہیں ایک دم ہنسی آجاتی اور ان کی پوزیشن ڈگمگانے کا خدشہ پیدا ہو جاتا کیونکہ وہ اتنی نرم دل تھیں کہ ان سے واقعی ڈر لگتا تھا۔

مس رام میری کلاس نہیں لیتی تھیں صرف گیمس پر آتی تھیں۔ خود انہیں گیمس سے وحشت ہوتی تھی مگر اپنی ڈیوٹی بجا لانا فرض سمجھتی تھیں۔ مس رام ایک انگریز کے دامِ محبت میں گرفتار

ہوگئی تھیں۔ وہ پولس میں تھا اور اس کی منگیتر ولایت میں تھی۔ مس رام اس وقت بے حد حسین تھیں۔ ان کی شادی اس پولس والے سے نہ ہوسکی اور وہ محکمۂ تعلیم میں غرق ہوگئیں۔ جب علیگڑھ آئی تھیں تو بے حد خوبصورت تھیں۔ کئی پروفیسروں نے ڈورے ڈالے مگر یہ بالکل تارک الدنیا ہوگئیں۔

کتنی حسین و دلچسپ تھی کالج کی زندگی۔ ایک ایک بات دل پر نقش ہے۔ ہنسی مذاق ہی نہیں۔ وہ وقت جو اعلیٰ بی کے ساتھ گذرا جو پاپا میاں کے قدموں میں بیٹھ کر بتایا۔ اعلیٰ بی دوستوں جیسا برتاؤ کرتی تھیں۔ ان کی باتوں میں کہانی قصوں جیسا چٹخارہ تھا۔ اسکول کے قیام میں کیا کیا لعنتیں اور بدنامیاں سہیں۔ ان کا خاندان بڑا روشن خیال تھا۔ شادی سے پہلے ہی انہوں نے لڑکیوں کا اسکول کھولنے کے خواب دیکھنے شروع کردئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں میں بڑی شدت سے احساس پیدا ہورہا تھا کہ وہ دوسرے فرقوں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ خاص طور پر عورتوں کے معاملے میں تو بہت ہی جہالت کا زور ہے۔"

عصمت چغتائی اپنی طالب علمی کے زمانے کے یادوں کے نقوش کو کچھ اس طرح ڈرامائی انداز میں پیش کرتی ہیں کہ "انہیں دنوں ایک طوفان پھٹ پڑا۔ لکھنؤ کے کچھ منچلے نوجوانوں نے ایک کتاب "انگارے" چھاپ ڈالی۔ انگارے اور وہ بھی اردو یعنی مسلمانوں کی جاگیری زبان میں۔ ایک ہنگامہ مچ گیا اور ایک ملّا شاہد احراری اس کا نام تھا، گرلز کالج پر پل پڑا۔ اس نے ایک چیتھڑا سا اخبار نکالا اور عبداللہ فیملی کی دھجیاں اڑانے لگا۔ اس نے کہا کہ گرلز کالج رنڈی خانہ ہے اسے فوراً بند کردیا جائے اور رشیدہ آپا اور دوسرے لکھنے والوں کے گندے گندے کارٹون نکالے۔

میں نے وہ کتاب نہیں پڑھی تھی، لیکن احراری نے دل میں اس کتاب کو پڑھنے کی لگن پیدا کردی۔ نہ جانے کہاں سے وہ کتاب بورڈنگ میں کسی ڈے اسکالر نے لادی اور راتوں رات لالٹین جلاکر، روشنی نہ دکھائی دے اس لئے شیشوں پر رضائیاں لٹکا کر ہم نے وہ کتاب پڑھی اور ہل گئے۔

مگر پڑھ کر تذبذب میں پڑگئے۔ عریانیت اور گندگی بہت تلاش کی مگر پلے نہ پڑی مگر کسی کو یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ "انگارے" گندی نہیں۔ یہ سخت بے حیائی کا ثبوت ہوتا کہ کوئی شریف لڑکی "انگارے" کو گندہ نہ کہے۔ سب میری طرف دیکھنے لگیں۔ حالانکہ میری ہم خیال تھیں لیکن میری طرح بے لگام نہ تھیں۔ اب مجھے معلوم ہو چلا تھا کہ بہت سی باتیں جو یہ دل میں تو

مانتی ہیں مگر خوف سے زبان تک نہیں لا پاتیں تو چاہتی ہیں کہ میرے منہ سے سنیں۔ کتاب بے انتہا گندی ہے، میرے تو ہاتھ سڑ گئے، دل سڑ گیا، دماغ سڑ گیا، چلو نماز کے کمرے میں توبہ کریں۔ اللہ سے معافی مانگیں۔ اللہ کو یہ کتاب بہت ناگوار گذری ہوگی۔''

''ایسی باتوں کا مذاق نہیں بنانا چاہئے۔''

''مذاق کون نامعقول بنا رہا ہے۔ شریف لوگ کہتے ہیں کہ گندی ہے تو جھوٹ تو نہ بولتے ہوں گے۔''

انگارے پڑھ کر ملاّ احراری کا چیتھڑا پڑھا تو جی خوب جلا اور میں نے ایک مضمون لکھا۔ کچھ اس قسم کا کہ ''مسلمان لڑکیاں پہلے ہی محروم اور پچھڑی ہوئی ہیں اوپر سے کٹر ملاّ احراری جان کا دشمن ہو رہا ہے۔ کالج بند کر دیا جائے مگر ہم ساری لڑکیوں کی یہاں سے بس لاشیں ہی جائیں گی۔ کون بند کرنے آئے گا۔ ہم اس سے نپٹ لیں گے اور یونیورسٹی میں ہمارے چھ ہزار بھائی ہیں، کیا وہ خاموشی سے ہماری لاشوں کو کچلتا دیکھیں گے۔ جب بھی ہمیں ملاّ احراری کا خیال آتا ہے ہم اپنے چھ ہزار بھائیوں، بزرگ پروفیسروں اور اسکول ٹیچروں کو یاد کر لیتے ہیں۔ تب ہماری ہمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ جب تک وہ سلامت ہیں کوئی مائی کا لعل ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ جھانسی کی رانی نے شہنشاہ ہمایوں (بہادر شاہ ظفر) کو راکھی بھیجی تھی۔ ہم کالج کی تمام لڑکیاں اپنے ہزاروں بھائیوں کی خدمت میں نیک خواہشات کے ساتھ احترام اور خلوص کی راکھی بھیجتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ہماری رکھوالی کے لئے کوئی قدم اٹھائیں گے۔''

میں نے مضمون جو طویل اور جذباتی تھا لڑکیوں کو سنایا۔ ایک بلّڑ مچ گیا۔ پاپا میاں کو خبر پہنچی وہ آئے اور سنا۔ اسی وقت لفافہ منگوا کر علی گڑھ گزٹ کو بھیج دیا۔ دوسرے دن مضمون چھپ گیا۔

لڑکوں نے وہ مضمون پڑھا اور اسی رات جا کر ملاّ احراری کی خوب ٹھکائی کی۔ دفتر توڑ پھوڑ ڈالا۔ کسی کو اس کی حمایت کی ہمت نہ پڑی۔ ان لڑکوں کی رشتہ دار لڑکیاں کالج میں پڑھتی تھیں۔ ان کے ذریعہ لڑکیوں کا شکریہ پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد ملاّ غائب ہو گیا۔

اپنی اس فتح پر بورڈنگ میں خوب جشن منایا گیا۔ خوب الٹے سیدھے گانے گائے اور ٹینس کورٹ پر خورشید عبداللہ نے ڈانس کیا۔ کالج سے شیروانیاں منگوا کر مشہور شاعروں کا بھیس

بدل کران کا کلام پڑھا گیا۔ خورشید جہاں جو بھاری بھرکم اور گوری تھیں جوش ملیح آبادی بنیں، لتا جو خوب سانولی تھی، چمکدار سفید دانت تھے داڑھی لگا کر جگر مرادآبادی بنی، صفیہ سراج مجاز کی بہن تو اپنے بھائی کے کپڑے لے آئی وہ مجاز بنی تو سب کی چیخیں نکل گئیں۔ فاخرہ ساغر نظامی بنی۔ بے حد دلچسپ مشاعرہ رہا۔ خاتون آپا نے دوسرے دن کی چھٹی کا اعلان کیا۔ ٹینس کورٹ خاصا رقص گاہ بن گیا۔

ملّا احراری کا جنازہ سارے بورڈنگ میں گھمایا گیا۔ بیچ صحن میں چتا جلائی گئی جس کی آگ میں مونگ پھلیاں بھون کر کھائی گئیں۔

مہینوں اس فتح کا نشہ سوار رہا۔ رشیدہ آپا نے بے حد پیٹھ ٹھونکی۔ یہ ہماری اپنی جیت تھی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ کالج کے لڑکے لڑکیوں نے ایک مقدس رشتہ قائم کیا۔ کالج کے لڑکے اس وقت پابندی سے سیاہ شیروانی پہنتے تھے۔ کبھی ہم کسی مشاعرے میں اسٹریچی ہال جاتے یا نمائش میں لڑکوں کے غول لڑکیوں کے پیچھے لگتے تو الٹی لڑکیوں پر ڈانٹ پڑتی تھی۔ حالانکہ کالی اچکن سفید پاجاموں کے رواں دواں غول سے زیادہ ہماری پہچان نہ تھی۔ لڑکیاں کالج کے لڑکوں کو ''کوڑیالے'' کہا کرتی تھیں۔ کوڑیالا سانپ بے حد خطرناک ہوتا ہے اس کا ڈسا لہرا نہیں لیتا۔ یہ نام کچھ رومینٹک بھی لگتا تھا۔ لڑکیوں کے دل میں چھپا خوف اور کچھ دھندلا سا رومان اس لفظ سے وابستہ تھا۔ ان دنوں کالے دبلے سوکھے لڑکے بھی دور سے بڑے بانکے لگتے تھے۔ جب پاس سے دیکھا تو دل بیٹھ گیا۔ ان میں زیادہ تر کالے کھترے اور بدصورت تھے۔

اب تو لڑکے کالج میں فنکشن پر آزادی سے آتے ہیں، سیل کے موقعوں پر لڑکیاں ان کی خاطریں کرتی ہیں۔ قطعی کوڑیالے نہیں۔ اچھے بھلے انسان لگتے ہیں۔

پرانی لڑکیاں جو اب پروفیسر، لیکچرر اور ٹیچر بن گئی ہیں بڑی حسرت سے کہتی ہیں ''ہمارے زمانے کے لڑکے ہینڈسم ہوا کرتے تھے اب تو کوڑا آرہا ہے۔''

دراصل وہ پردہ جو درمیان میں حائل تھا، اپنے اندر نہ جانے کتنے خواب سموئے ہوئے تھا جو فنا ہوگئے۔ اب لڑکیاں لڑکوں کو دیکھ کر بوکھلاتی نہیں، انہیں اپنے جیسا طالب علم سمجھتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں پردہ ہٹا تو رومان ختم ہوگیا۔ اب بھی عشق چلتے ہوں گے اور بیاہ بھی رچتے

ہوں گے۔

اتنی بات تو ہے کہ پردہ ہٹتا ہے تو کچھ چھچھورے قسم کے جذبات جو صرف تصور کے بل پر پروان چڑھتے ہیں اور بڑی ذہنی الجھنوں کا باعث ہوتے ہیں، کچھ بلکہ بہت کچھ سلجھ جاتے ہیں۔ حقیقت زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ ایک دوسرے کو جنس مخالف ہی نہیں عام انسان کی حیثیت سے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اندھے معاشقوں کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ زندگی نسبتاً پائیدار بنیادوں کے سہارے بنتی سنورتی ہے۔

الیف اے کے بعد بی اے کا علیگڑھ میں کوئی انتظام نہ تھا۔ میری بینک بک میں ابھی کافی روپیہ تھا۔ ابا میاں نے لکھنؤ آئی ٹی کالج میں داخلہ لینے کی اجازت دے دی ...... لکھنؤ میں گذارے ہوئے دو سال میری زندگی میں بہت اہم ثابت ہوئے۔ دماغ کو نئی راہیں ملیں۔ نئے دروازے کھلے۔" (15)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنے قیام سے ہی نہ صرف تعلیمِ نسواں کو خصوصی اہمیت دی بلکہ عظمتِ نسواں کا بھی خاص خیال رکھا۔ کسی بھی مسلم یونیورسٹی کا پہلا چانسلر ایک خاتون کو منتخب کرنا اپنے آپ میں بہت ہی انقلابی فیصلہ تھا۔ مسلمانوں کے ایسے سماج میں جہاں جدید تعلیم کی مخالفت کے لئے فتوؤں کی فیکٹریاں کھلی ہوں، مگر علی گڑھ والوں نے ہمیشہ اپنی روشن خیالی کا مظاہرہ کیا اور 1920ء میں سلطان جہاں بیگم کو اس یونیورسٹی کا پہلا چانسلر مقرر کیا۔ بیگم صاحبہ تعلیمِ نسواں کی پرزور مبلغ تھیں۔ انہوں نے چانسلر کی حیثیت سے 1922ء میں اپنے پہلے کنووکیشن ایڈریس میں تعلیمِ نسواں کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ "اسی طرح شعبۂ تعلیمِ نسواں سے بھی تغافل نہیں کرنا چاہئے۔ گذشتہ زمانہ میں اس کی جانب سے سخت غفلت برتی گئی ہے۔ اب جب کہ تعلیم کا انتظام آپ کے ہاتھوں میں ہے اور یونیورسٹی کو اختیار ہے کہ اپنی ضروریات کے مطابق نصاب بنائے اور طریقۂ امتحان میں ترمیم کرے تو اس معاملہ میں ایک لمحہ کی دیر بھی ناقابلِ معافی ہے، آپ کے پاس ایک اچھا اسکول موجود ہے اور آپ اس کو یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیمِ نسواں کا عمدہ نمونہ بنا سکتے ہیں لیکن اس موقعہ پر یہ کہنا نہایت ضروری ہے کہ اس خاص شعبہ میں دیگر اقوام کی تقلید محض اپنی خاص معاشرتی خصوصیات اور قومی روایات سے انحراف

کسی طرح روا نہ رکھا جائے۔ ظاہر ہے کہ ہر قوم کی معاشرتی، مذہبی اور قومی خصوصیات جداگانہ ہیں اور ان ہی اسباب سے اس کی ضروریات بھی جداگانہ ہوتی ہیں۔ یہ بھی ایک مسلمہ امر ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے نصابِ تعلیم میں تفریق لازمی ہے۔ لڑکیوں کے لئے ایسے نصاب کی ضرورت ہے جس سے نسوائی فرائض کو پورے طور پر ادا کرنے کی قابلیت پیدا ہوسکے۔ اسلئے آپ کو ان کا نصاب بناتے وقت یہ امور پیشِ نظر رکھنے چاہئیں اور ہر ایک پہلو میں اسلامی شان ملحوظ رہنی چاہئے۔" (16)

شیخ عبداللہ اور اعلیٰ بی کا قائم کردہ زنانہ اسکول ابھی ہائی اسکول کی منزل تک ہی پہنچ پایا تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے تعلیمِ نسواں کے لئے اپنے دروازے کھول دیئے اور مسلم یونیورسٹی کے وجود میں آنے کے تین سال بعد ہی 1924ء میں پاشا بیگم نے گریجویشن کی ڈگری حاصل کرلی اور اس طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں پاشا بیگم کو پہلی خاتون گریجویٹ ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ 1926ء میں امتل رشید بیگم اور 1928ء میں پٹن خیر النساءٔ گوشال نے سیکنڈ کلاس میں بی اے کی ڈگری حاصل کی جہاں تک پوسٹ گریجویٹ ایجوکیشن کا سوال تھا۔ یونیورسٹی ریکارڈ کے مطابق مس آر سروجنی دیوی نے 1931ء میں ایم اے (انگریزی) کی ڈگری حاصل کی۔ مسز جی ایم خان پہلی ایسی خاتون تھیں جنھوں نے 1927ء میں بی۔ ٹی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ (17) جب کہ ایشوری پرساد 1879ء میں مدرستہ العلوم کے سب سے پہلے گریجویٹ ہوگئے تھے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ویمنس ایجوکیشن کی توسیع و ترقی کے لئے باقاعدہ ایک مشاورتی بورڈ بھی قائم کیا تھا اور لڑکیوں کو تمام کورسوں میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت تھی۔ بورڈ آف ویمنس ایجوکیشن کا صدر وائس چانسلر ہوتا تھا جب کہ دیگر ممبران میں پرو وائس چانسلر، دو ایگزیکیٹو کونسل کے نمائندے اور اکیڈمک کونسل کے تین نمائندے ہوتے تھے۔ رجسٹرار بورڈ کے سکریٹری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس بورڈ کا اصل کام کلاس روم میں اور امتحان گاہ میں لڑکیوں کے لئے پردے کا انتظام قائم کرنا تھا۔ لڑکوں کی طرح لڑکیوں پر کلاس میں حاضری کی پابندی نہیں ہوتی تھی اور انہیں پبلک لیکچر سے بھی آزاد کردیا گیا تھا۔ 1932ء کے بورڈ آف ویمنس ایجوکیشن میں ایگزیکٹو کونسل کے نمائندے کے طور پر خان بہادر شیخ عبداللہ اور خان بہادر سید زین الدین

جب کہ اکیڈمک کونسل کے نمائندے کے طور پر جناب ایم ایم شریف، ماہرِ تعلیم خواجہ غلام السیدین اور ممتاز مورخ پروفیسر محمد حبیب اس بورڈ کے رکن تھے۔ (18)

تقسیم اسناد کے جلسہ میں ان ڈگری یافتہ خواتین کو اسٹیج پر جا کر مہمانِ خصوصی سے ڈگری وصول کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کی ڈگریوں کو ڈاک کے ذریعہ ان کے گھر کے پتہ پر بھیج دیا جاتا تھا۔ یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار سجاد حیدر یلدرم کی صاحبزادی اور اردو کی ممتاز ادیبہ قرۃالعین حیدر اس سلسلے میں مزید روشنی ڈالتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ''جس زمانے میں والدِ مرحوم علی گڑھ یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے، چند علماٗ کی طرف سے اعتراض ہوا کہ جلسہ تقسیم اسناد کے موقعہ پر خواتین پردے کے پیچھے بھی شرکت نہ کریں۔ جس پر امّاں کا شعلہ جوالا مضمون شائع ہوا کہ پانی کی مچھلی بھی چند سیکنڈ کے بعد پانی کے اوپر سر نکال کر ٔئی ہوا میں سانس لیتی ہے۔ آپ کو ہمارے لئے یہ بھی منظور نہیں۔ 1920ء میں جب کمال عطاترک نے پردہ قانوناً ممنوع قرار دیا تو والد مرحوم جو ہر چیز میں ترکی کے مقلّد تھے، انہوں نے امّاں سے کہا تم بھی پردے سے نکلو۔'' (19)

1920ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے وقت سرسید کی تربیت یافتہ پہلی نسل تیار ہو کر عملی زندگی میں داخل ہو چکی تھی۔ ان میں سے بیشتر نے تحریکِ آزادی میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور ایم اے او کالج کے بعض طلباٗ یونیورسٹی اسٹاف میں بھی شامل ہو گئے تھے۔ اسی دوران مہاتما گاندھی کی تحریک پر سودیشی آندولن اور انگریزی تعلیم کی مخالفت بھی شروع ہو چکی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کالج کے بعض جوشیلے نوجوانوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے ایک نئی یونیورسٹی کے قیام کا اعلان کر دیا۔

ایم اے او کالج کی اس پہلی نسل کے نوجوانوں نے اپنی بیٹیوں کو پڑھانا شروع کر دیا اور مسلمانوں کے ذہنوں میں ایک بڑی انقلابی تبدیلی رونما ہونے لگی۔ شیخ محمد عبداللہ کی بھی بیٹیوں کے علاوہ میر ولایت حسین، ڈاکٹر سر ضیاٗ الدین کی بیٹیاں اسکولوں میں داخل ہونے لگیں۔ شیخ صاحب کی بڑی بیٹی رشید جہاں، ڈاکٹر سر ضیاٗ الدین کی بیٹی اعجاز فاطمہ، میر ولایت حسین کی بیٹی ڈاکٹر زبیدہ صالح نے ڈاکٹری کی تعلیم لیڈی ہارڈنگ کالج، دلّی سے حاصل کی تھی۔ ڈاکٹر اعجاز فاطمہ نے اپنے والد مرحوم کے نام پر پاکستان کے کراچی شہر میں ایک ہسپتال قائم کیا اور بعد میں

ڈاکٹر سر ضیاءُ الدین میڈیکل یونیورسٹی قائم کی۔ علی گڑھ کی تاریخ میں وہ پہلی ایسی خاتون ہیں جنہوں نے اپنے شوہر کے ساتھ ایک میڈیکل یونیورسٹی قائم کی۔

20ویں صدی کی دوسری دہائی میں رومانی تحریک میں بھی علی گڑھ کا اچھا خاصا حصہ رہا۔ اس وقت حسرت موہانی کی رومانی شاعری کا چرچا عام تھا۔ 1930ء کی دہائی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی نئی نسل کی جدید فکر اور ثقافتی طاقت کا گڑھ بن چکی تھی۔ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو نیا رخ دیا تو یہاں بھی علی گڑھ پیچھے نہیں رہا۔ اختر رائے پوری، سبطِ حسن، خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، مجاز، جاں نثار اختر، علی سردار جعفری، معین احسن جذبی، آل احمد سرور سب علی گڑھ کے طالب علم تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کے بانی ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر عبدالعلیم استادوں میں سے تھے۔ ڈاکٹر محمد اشرف 1925ء میں طلبا یونین کے نائب صدر بھی رہ چکے تھے۔ علی گڑھ میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم ہوئی تو آل احمد سرور کو اس کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ ترقی پسند قلم کاروں کی میٹنگوں میں مردوں سے زیادہ خواتین حصہ لیتی تھیں۔ (20) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اس اشتراکی ماحول کو اختر رائے پوری کی بیگم سے زیادہ اور کوئی بیان نہیں کرسکتا۔ وہ کہتی ہیں "محمود الظفر، ڈاکٹر رشید جہاں، امیر منزل کے مکین اختر رائے پوری، سبطِ حسن، اشرف، اطہر علی اور مجاز نیلی چھتری میں میٹنگیں کرتے۔ اس وقت یونیورسٹی میں کمیونزم نامی ایک مرض کے جراثیم بڑی تیزی سے پھیل رہے تھے اور ہم سب کی کوشش تھی کہ جلد سے جلد اور تیزی سے اس مرض کو پھیلایا جائے۔ ملک کو آزاد کرانے کی کوششیں ہر جتن سے کر رہے تھے۔ آپ خواتین کو بھی اس نیک کام میں شریک ہونا چاہیے۔ پرسوں میں اور سبطِ حسن جواہر لعل نہرو کو دہلی سے علی گڑھ لا رہے ہیں۔ پروفیسر حبیب صاحب کے یہاں ٹھہرائیں گے۔ وہاں آپ سب کا آنا جانا ہے۔ جمیلہ کے ساتھ وہاں آیئے۔ شاید ان کی باتیں سن کر آپ لوگ بھی جاگ جائیں۔ یہ مٹی کی مورتیاں بن کر اگر ملک کی آدھی آبادی بیٹھی رہے گی تو کام کیوں کر بنے گا؟ بے شک یہ سب باتیں ہم سمجھے بھی اور ایک نیا سا جذبہ دل میں جگہ پانے لگا تھا۔ میرے ہاتھ میں ساقی کا پرچہ اختر نے تھما دیا۔ اس میں ان کا افسانہ "اندھا بھکاری" چھپا تھا۔"

صفیہ کی زبانی معلوم ہوتا کہ اختر حسین رائے پوری نے یونیورسٹی میں ایک اودھم سا مچا

رکھا ہے۔ ایک ہفتہ وار اشتراکی قسم کا اخبار نما ہاتھ سے لکھ کر ہاسٹل کی دیوار پر چسپاں کر دیتے ہیں جس کی نقل تیزی سے ہر ہاسٹل کی دیوار پر لگائی جاتی ہے۔ اس کی خبریں ساری ہی تو اشتراکی اور آزادی کے لئے جدوجہد کی ترغیب، ہندو مسلم اتحاد کے لئے کام کرو، انگریزوں کی مخالفت کرو۔ نمازِ فجر کی حاضری رجسٹر پر لگائی جاتی تھی۔ اختر ایک ہزار دانوں والی تسبیح ہاتھ میں لئے عربی چغہ پہن کر نماز کے لئے جاتے، اس پر بے چارے خیری صاحب گرفت بھی نہ کر سکتے تھے، لیکن اور لڑکوں کی ہنسی ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔

اردو کے مشہور ناول نگار ظفر عمر کی بیٹی حمیدہ عمر اختر رائے پوری کے افسانوں کی دیوانی ہوگئیں۔ اسی زمانے میں صفیہ جاں نثار کو دل دے بیٹھی تھیں۔ اختر نے نیلی چھتری کی دیوار پر موٹے موٹے حروف میں کوئلے سے یہ شعر لکھ دیا۔

اتنی کسے پڑے تھی کہ پتھر کو پوجتا
سجدوں سے میرے رونقِ بت خانہ ہوگئی

جس کو حمیدہ نے اپنا ڈوپٹہ گیلا کر کے مٹا دیا کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ بعد میں یہ سلسلہ خطوں میں تبدیل ہوگیا۔ پہلے شکورن دھوبی کو استعمال کیا گیا اور پھر مجاز کی بہن صفیہ نے یہ خدمت انجام دی۔ دل نے کہا کہ چلو اختر کے خط پھر سے پڑھو "تمہیں حاصل کرنے کے لئے نہ اپنی خودداری کو سرنگوں ہونے دوں گا اور نہ ضمیر فروشی کروں گا۔ میں آزاد ہوں اور یوں ہی رہوں گا۔ آج نہیں تو کل جیل خانے کے لئے کمر بستہ رہوں گا، بلکہ اس سے بھی زیادہ کے لئے۔ میں تمہیں عیش سے نہ رکھ سکتا ہوں نہ اس کی کوشش کروں گا۔ اب تم خود اپنے دل سے پوچھو کہ اس کے باوجود ایسے آدمی کا ساتھ دے سکتی ہو یا نہیں؟ میری تو ہمیشہ یہ خواہش رہے گی کہ جس سے محبت کی میں انہیں راحت سے دیکھوں۔ میں نے تو اغراض و مقاصد کی یگانگت کا ذکر صرف اس لئے کیا تھا کہ تم میری شورش طلب زندگی دیکھ اور سمجھ لو اور یہ جان لو کہ ایسے آدمی سے صرف تب ہی نبھ سکتی ہے جب اس کی ذات سے نہیں بلکہ ان چیزوں سے ہمدردی ہو جن کے لئے وہ زندہ ہے۔ بابا۔ تم مردوں کے معیار سے مجھے کیوں جانچتی ہو، جو گھر بار سے بے نیاز، نہ نام اور نمود کا خواہاں، نہ دولت اور غرض کا بندہ۔ آخر دوسروں سے وہ کچھ تو مختلف ہے۔"

میرے اقرار کے بعد اختر نے ایک خط ابا کو لکھا ''ایک بندۂ ناچیز جس کا دنیا میں کوئی نہ ہو، پر علم کی دولت کے خزانے کی چابی مٹھی میں تھامے ہوئے مزید اس کو حاصل کرنے کے عزم کے ساتھ اس کی سمت رواں دواں ہے۔ آپ کی صاحبزادی حمیدہ عمر کے لئے درخواست گذار ہے۔ اگر قبول کرلیں تو زہے نصیب اور قبول نہ فرمائیں تو شکوہ آپ سے نہیں بلکہ اس خدا سے ہوگا جو بڑا رحیم و کریم ہے۔''

اماں نے کہا... ''تو لو سنو... تمہارے ابا نے تمہاری شادی اختر حسین نامی لڑکے سے کرنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ میں نے بہت منع کیا۔ اب میری سمجھ میں صرف ایک ہی بات آرہی ہے کہ تم کاغذ پر خود یہ لکھ دو کہ ''مجھے رشتہ منظور نہیں ہے۔ پھر وہ کچھ نہ کرسکیں گے۔'' میرے منھ سے بے ساختہ نکل گیا ''مگر کیوں؟''

''تو سنو یہ لڑکا ایک رائٹر ہے۔ میرے خیال میں ہر شاعر، ہر رائٹر، ہر مصور اپنی شریکِ حیات سے چاہتا ہے کہ میری آنکھ سے دیکھو، اور میرے دماغ سے سوچو۔ جو ممکن نہیں ہوتا کہ ہر شخص اپنی آنکھ رکھتا ہے اور اپنا دماغ۔ ہر ایک کی زندگی میں اونچ نیچ آتی ہے، مگر ایسے لوگوں کے ساتھ پہاڑ اور سمندر پار کرنا بہت مشکل کام ہے۔ پھر تم جتنی سیدھی لڑکی کے بس کی یہ بات ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ پائے گی۔'' 30/دسمبر 1935ء کو دونوں کی شادی ہوگئی۔ مولوی عبدالحق (بابائے اردو) نے دولہا کے باپ کے فرائض انجام دئے۔ (21)

مجاز کی بہن حمیدہ سالم کے قول کے مطابق ''علی گڑھ یونیورسٹی کا یہ دور اس کی تاریخ کا روشن ترین دور کہا جاسکتا ہے۔ اس کے افق پر ایسے ایسے ستارے جگمگائے جن کی روشنی سے ملک کا کونہ کونہ فیض یاب ہوا۔ علم و ادب، شعر و شاعری، سیاسی و سماجی غرض یہ کہ ہر میدان میں علی گڑھ کے طلباً نمایاں نظر آرہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہاں سے علم و شعور کے سوتے پھوٹ رہے ہوں جو دیش کے لئے جوئے حیات کا کام دے رہے ہوں۔ کوئی جوشیلا سماجی کارکن تو کوئی مہم آزادی کا پر جوش سپاہی، گویا سب ہی اپنے اپنے ہتھیاروں سے فرسودہ نظام کو جڑوں سے اکھیڑنے پر آمادہ۔ دامے، درمے اور سخنے جو نام ذہن میں آرہے ہیں وہ تعارف کے محتاج نہیں۔ سعادت حسن منٹو، علی سردار جعفری، سبطِ حسن، شاہد لطیف، اختر الایمان، اختر رائے پوری، جاں نثار اختر،

معین احسن جذبی، خواجہ احمد عباس، مجاز اور انصار ہروانی ۔ اس وقت پردے کے پیچھے عصمت چغتائی اور صفیہ جاں نثار اختر بھی تھیں۔

ادبی رجحان رکھنے والے ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے میں اور ادب اور شاعری کو عملی مقصد کے تابع کرنے میں لگے ہوئے تھے۔اس تحریک کو ترقی پسند ادب کا نام دیا گیا۔اس تحریک سے وابستہ نوجوانوں میں کچھ کا لہجہ انتہائی جارحانہ اور خطیبانہ تھا اور انہیں میں سے کچھ نے Self-determination کی تھیوری کا دھوکہ کھا کر ملک کی تقسیم میں مدد کی لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ان میں سے ہر ایک کے ہی سامنے ایک مقصد تھا، ایک منزل تھی، سوچ تھی، شعور تھا۔ برطانوی سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا جذبہ تھا۔ کسی کا اظہار قلم سے تھا تو کسی کا عمل سے۔

میرس روڈ پر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کی کوٹھی ضیاء کمپاؤنڈ ہے جہاں مجاز، انصار ہروانی، صفیہ اور حمیدہ رہا کرتی تھیں اور دوسری طرف گرلس ہاسٹل کی سرخ رنگ کی وہ سخت دل اور ناقابلِ عبور دیوار تھی، جس کے پیچھے ان کے تخیل کی حسینائیں مقید تھیں۔ سو شام کو ہوا خوری کے بہانے یہ سڑک بہت موزوں تھی۔ تازی ہوا تو یونیورسٹی کی سڑکوں پر بھی حاصل ہو جاتی تھی لیکن اس سڑک پر تصورِ جاناں کا ایک خاص ہی لطف تھا۔ محبوباؤں سے اتنا قرب اور اتنی دوری۔ آخر کیوں؟ یہ سوال بھی سب میں مشترک تھا۔

حمیدہ لکھتی ہیں کہ ''اس دور میں اسرار بھائی کی حیثیت ایک ایسی شمع کی سی تھی جس پر ہزاروں پروانے نچھاور ہونے کے لئے بے تاب تھے اور گرلس کالج کے ہاسٹل کی پتھریلی دیوار کے پیچھے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ لیکن اس دیوار سے زیادہ پتھریلی اور سنگ دل تھیں وہ اقدار جن کے تحت انسان کا تول اس کی شرافت اور انسانیت سے نہیں بلکہ جیب میں سکوں کے وزن سے ہوتا ہے۔''

عصمت آپا نے لکھا ہے کہ ''لڑکیاں کتابوں کے اندر اپنے محبوب شاعر مجاز کی تصویریں چھپا چھپا کر رکھتی تھیں۔ ان کے نام کے قرعے نکالے جاتے تھے۔ ہاسٹل کی دیوار میں شگاف ممکن تھا، پر اللہ بھلا کرے ان سماجی اقدار کا ان کاٹس سے مس ہونا ممکن نہ تھا۔ یہ پروانے پھڑ پھڑاتے ہی رہ گئے اور شمع قطرہ قطرہ پگھلتی گئی، گھلتی گئی اور آخر کو بجھ گئی اور یہ پروانے تماشائی بنے رہ گئے اور

وہ بھی دور سے۔''

حمیدہ سالم اپنے دوسرے بھائی انصار الحق ہروانی سے متعلق معلومات فراہم کرتی ہیں کہ ''علی گڑھ کی فضا... انصار بھائی کے نیشنلزم کے اس پودے کو بہت ہی راس آئی جس کا بیج تحریکِ خلافت کے دوران گاندھی جی زندہ باد، علی برادران زندہ باد کے نعروں نے بویا تھا اور جن کی آبیاری امین آباد کے پارک میں لیڈرانِ قوم کی تقریروں نے کی تھی۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران اس پود کی تازگی اور توانائی میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔

علی گڑھ پہنچنے پر انصار بھائی کا داخلہ یونیورسٹی کے اسکول منٹو سرکل میں ہوا۔ چند مہینوں بعد ہی ان میں اور باچھو بھائی (خواجہ احمد عباس) میں دوستی ہوگئی۔ یہ بھی اپنی جگہ دلچسپ سی بات ہے کہ آپسی وجہۂ کشش تھی انصار بھائی کی کھدر کی لال ترکش کیپ۔ ورنہ سینئر اسٹوڈینٹس جونیئرس کو منھ لگانا ایک طرح سے اپنی عزت کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس وقت باچھو بھائی یونیورسٹی میں تھے اور انصار بھائی اسکول میں۔

انصار الحق ہروانی کے دورِ طالب علمی میں رات گئے اسٹیشن آکر پلیٹ فارم کی چہل قدمی کرنا دل چسپ ترین مشغلہ تھا۔ پروکٹر آفس کی عائد کردہ پابندیوں کو توڑنے کا مزہ تو تھا ہی۔ ساتھ ساتھ اس کا امکان تھا کہ شاید ٹرین سے اترتی چڑھتی یا جھانکتی ہوئی کسی لڑکی کے چہرے سے نقاب کھسک جائے اور ان کو کسی حسین چہرے کی جھلک نصیب ہوجائے۔ جاڑوں کی راتوں میں اسٹیشن کی گرم چائے میں بھی ایک خاص مزہ تھا۔''

حمیدہ سالم کہتی ہیں کہ ''جوانی میں ان کی شخصیت بہت پر کشش تھی۔ اچھے کھانے، اچھے پہننے اور اسمارٹ رہنے کا شوق تھا۔ اس سلسلہ میں اچھو بھائی جان نے ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ دیر رات وہ ہمارے گھر پہنچے۔ انصار بھائی کو پلیٹ فارم گردی کے لئے بلانے۔ دوستوں میں طے تھا کہ کھڑکی کے پاس وہ کتے کے بھونکنے کی آواز نکالیں گے اور اس آواز پر انصار بھائی خاموشی کے ساتھ ساتھ باہر نکلیں گے۔ ایک رات ان کے نکلنے میں دیر ہوئی۔ دوستوں نے وجہ تاخیر پوچھی۔ انصار بھائی نے جواب دیا کہ وہ کولڈ کریم کی شیشی تلاش کر رہے تھے جو اندھیرے میں مل نہیں رہی تھی۔ سوال یہ ہوا کہ اس وقت کولڈ کریم کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ جواب تھا کیا خبر کوئی

لڑکی نظر آجائے۔ کھدر پوش ہونے کے بعد بھی وہ اپنے کرتے پاجاموں کی سفیدی اور کلف و استری کا بہت دھیان رکھتے تھے۔

جوانی کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ ان کی تشفی کے لئے وہ اور ان کے دوست عبداللہ لاج پہنچ جایا کرتے تھے۔ پاپا میاں (شیخ عبداللہ) سے بہت قرب رکھتے تھے۔ بہانہ تھا تعلیم نسواں کی حمایت اور اس تحریک میں شرکت۔ اس وقت اس کوٹھی کی حیثیت ایک پرستان کی سی تھی۔ ان کی لڑکیاں حسین پڑھی لکھی اور پردے کی پابندیوں سے آزاد تھیں۔ آگے چل کر ہروانی کی زندگی سیاسی و سماجی مسائل میں کچھ ایسی الجھی کہ ملک کی آزادی ہی جذبۂ عشق کا مرکز بن کر رہ گیا۔

انصار الحق ہروانی فیروز گاندھی کے بھی گہرے دوست تھے۔ جب اندرا گاندھی جوانی میں اپنی زندگی کے رومانی دور سے گذر رہی تھیں اور وہ اور فیروز گاندھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے کے لئے بے چین تھے، پنڈت جی کے تذبذب سے ان کے ذہن پر جو بوجھ تھا اس کو اتارنے میں انصار ہروانی کا بھی ہاتھ تھا۔ پنڈت جی الہ آباد سے جس دن لکھنؤ پہنچنے والے تھے اسی صبح رفیع احمد قدوائی کے اشارے پر انصار ہروانی نے اپنے اخبار نیشنل ہیرالڈ میں فیروز گاندھی کے ساتھ اندرا جی کی ہونے والی شادی کی خبر شائع کردی۔ پنڈت جی جہاں دیدہ تھے قبل اس کے کہ طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوں اور نمک مرچ کے ساتھ افواہیں پھیلیں انہوں نے مناسب سمجھا کہ خبر کی تصدیق کردیں اور واردھا میں گاندھی جی کی سرپرستی میں اندرا جی اور فیروز گاندھی کے رشتہ کی تقریب کا اعلان ہو گیا۔'' (22)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سرزمین سے لکھی جانے والی اردو کی تحریروں میں ایک نمایاں اور منفرد مقام صفیہ جاں نثار اختر کے خطوط کو حاصل ہے۔ صفیہ نے گرلس اسکول میں ساتویں کلاس سے لے کر یونیورسٹی تک کی تعلیم حاصل کی اور پھر ٹیچرس ٹریننگ کالج میں ہی ملازمت اختیار کی۔ وہ مجاز، انصار ہروانی اور حمیدہ سالم کی بہن، جاں نثار اختر کی بیوی اور فلمی دنیا کی مشہور ہستی جاوید اختر کی ماں تھیں۔

انہوں نے 1936ء میں علی گڑھ گرلس کالج سے انٹر کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ صفیہ علی گڑھ گرلس کالج میں شروع سے ہی مجاز کی بہن کی حیثیت سے پہچانی جاتی تھیں۔

ان دنوں بی اے کی کلاسیں بے پردہ ہوتی تھیں جہاں خواتین ٹیچرس پڑھاتی تھیں اور چند کلاسیں پردے میں ہوتی تھیں جہاں یونیورسٹی کے مرد اساتذہ آکر پڑھاتے تھے۔ آل احمد سرور نے ''خواب باقی ہیں'' میں لکھا ہے کہ شیخ عبداللہ کی درخواست پر انہوں نے بھی کچھ اردو کی کلاسیں پردے میں رہ کر پڑھائی تھیں۔ صفیہ سماج کی عائد کردہ بے جا پابندیوں کو ٹھکرانے اور گھسی پٹی روایات کو توڑنے کا حوصلہ رکھتی تھیں۔ حمیدہ سالم کے مطابق ''ہم دونوں بہنیں علی گڑھ میں بے پردہ تھے۔ 1942ء صفیہ آپا کی زندگی کے لئے بہت اہم ثابت ہوا۔ سلمیٰ آپا کے رشتہ کے بھائی اپنی کزن سے ملنے گرلس کالج آئے۔ انہوں نے اپنے دوست مجاز کی بہن ہونے کے ناطے صفیہ آپا سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ سلمیٰ آپا سے ان کی دوست کا ذکر بھی سن چکے ہوں گے۔ یہ شام اختر اور صفیہ آپا کی ملاقات کی پہلی شام تھی۔ ایک کھوئی کھوئی سی شخصیت، اپنے سے بے نیاز، اپنے اردگرد سے بے نیاز، لہجہ دھیما دھیما اور نرم سا، حلیہ شرمیلا سا، پیشانی پر پڑے ہوئے کچھ الجھے اور بکھرے ہوئے بال جنہیں گاہے گاہے گردن کو جھٹکا دے کر ہٹانے کی کوشش۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ ان کی پوری شخصیت ہی کچھ ایسے الجھاؤ اور بکھراؤ کا شکار ہے کہ سمیٹے نہیں سمٹ رہی ہے پر وہ تھک ضرور گئے ہیں اور سہارے کی خواہش رکھتے ہیں۔

غرض یہ کہ بھائی اختر کے شاعرانہ انداز، شاعرانہ مزاج اور شاعرانہ حلیہ نے پہلی ہی ملاقات میں صفیہ آپا کے دل کو جیت لیا۔ عقل نے بھی حامی بھردی کہ ایک ہم مذاق ہم ذوق ساتھی مل جائے۔ پیاسی زندگی کو اس سے زیادہ کیا چاہئے۔''

صفیہ کا پہلا خط جو ان کی خطوط کی پہلی کتاب ''حرف آشنا'' میں شائع ہوا ہے وہ لکھنؤ سے جاں نثار اختر کو لکھتی ہیں ''عزیزم اختر صاحب۔ آپ کو یہ اجنبی تحریر دیکھ کر حیرت ہوگی... بہر حال فعل اپنی جگہ جسارت آمیز ضرور ہے... رواج اور روایت کو شاید لرزہ ہی آجائے میرا یہ قدم دیکھ کر، مگر کیا کروں کہ اکثر اپنے کو وہاں پاتی ہوں، جہاں پگھلی ہوئی زنجیر آئینِ قدامت ہے۔''

صفیہ کی جاں نثار اختر سے 25/دسمبر 1943ء کو لکھنؤ میں شادی ہوگئی۔ صفیہ شادی کے بعد تقریباً نو سال زندہ رہیں اور 17/جنوری 1953ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ صفیہ کے خطوط جو ان کے انتقال کے بعد جاں نثار اختر نے ''حرف آشنا'' اور ''زیرِ لب'' کے عنوان سے شائع کرائے وہ اردو

ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں اور علی گڑھ کی تہذیبی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔

شادی کے بعد پہلے خط میں صفیہ اختر کو علی گڑھ سے لکھتی ہیں کہ ''اس طرف خیریت ہے۔ زندگی کتنی سونی ہے اور کتنی آباد... تمہارے تصور نے دل کے نگار خانے کا گوشہ گوشہ جگمگا رکھا ہے... یہ احساس بھی میرے لئے عجیب ندرت رکھتا ہے... دن بھر کالج کی لڑکیاں اور استانیاں بلبلہ بولتی رہتی ہیں اور اس توقع آمیز نگاہ سے مجھے دیکھتی ہیں، گویا مجھ میں کچھ موتی ٹکے ہوئے نظر آ ہی جائیں گے۔ پھر میری لاپرواہی اور بد پوشاکی کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ ضرور کہہ دیتی ہیں کہ Fresh ہوگئی ہو! گو یہ بھی غلط ہی ہوتا ہے کیونکہ ستم ظریفی یہ ہے کہ ''تازہ'' کے بجائے ''باسی'' ہو چکی ہوں۔ گواہی دینے پر تیار ہو گے یا نہیں۔''

صفیہ کو اپنے بھائی مجاز سے دلی محبت تھی۔ اسے اپنے بھائی پر نہ صرف یہ کہ فخر تھا بلکہ وہ ان کے لئے متفکر بھی رہا کرتی تھیں۔ جاں نثار اختر اور مجاز نہ صرف یہ کہ دوست تھے بلکہ دونوں اس زمانے میں علی گڑھ کے طالب علموں اور طالبات کے محبوب شاعر تھے۔ دونوں ترقی پسند تھے، دونوں کی نظمیں ان کی شہرت کا باعث تھیں۔ دونوں مے خوار تھے، دونوں تلون مزاجی کا شکار تھے۔ سلمیٰ حقی نے لکھا ہے کہ ''جب گرلس کالج کے ہاسٹل میں صفیہ نے ڈوب کر سرشاری میں مجاز کی نظم ''اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں'' سنائی تو ایک سماں بندھ گیا۔ صفیہ بھائی کی محبت میں، اس کی کسک، احساس اور درد کو اپنے دل میں محسوس کرتی تھیں، صفیہ کی آواز اور مجاز کے اشعار سے سننے والوں کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے تھے۔ مجاز کی زندگی کے حالات نے صفیہ کو اور دل شکستہ کر دیا۔ مجاز کثرتِ مے نوشی اور مدہوشی کی وجہ سے صفیہ اور والدین کے لئے جب پریشانی کا باعث ہوئے تو صفیہ نے بے چین ہو کر جاں نثار کو لکھا کہ... ''اسرار بھائی کا کوئی پتہ نہیں معلوم۔ یہاں تک بھی نہیں معلوم کہ وہ دہلی میں ہیں یا وہاں سے کہیں اور چل دئے۔ ان کی سیماب پائی کا اندازہ تم نہیں کر سکتے... ہر طرح کا امتیاز ان کے ذہن سے اٹھ چکا ہے۔ بس صرف ایک مقصد سامنے ہے، اس کے لئے وہ اپنے کو ہر خرابی میں مبتلا کرنے کو تیار ہیں... امّاں تڑپتی ہیں اور بے قرار ہو جاتی ہیں۔ ابو کو کہیں بھیجنا بھی چاہیں تو وہ اپنے لنگڑے پن کی وجہ سے مجبور ہیں۔ مجھے بچے کے وجود نے قطعی بے کس کر دیا ہے۔ ہم سب کے لئے صرف تمہاری ایک ذات

ہی رہ گئی ہے۔''

ایک ماں کی حیثیت سے جاوید اختر کے لڑکپن اور شرارتوں کے بارے میں لکھتی ہیں... ''جادو تو خیر سے مست ہے۔ ہر حسین لڑکی پر جان چھڑکنے کو تیار ملتا ہے... بچوں کے وجود نے سارے ارادوں میں اس طرح رکاوٹیں پیدا کی ہیں کہ خدا یاد آ گیا۔ تمہاری یہ فرمائش کہ دونوں بچوں کو قتل کر کے میرے پاس آ جاؤ۔ تجویز معقول ہی معلوم ہوتی ہے مگر Who will bell the Cat?.. خود پائپ منہ میں لگا کر عینک آنکھوں پر جما کر کرسی میں ماموں صاحب بن کر بیٹھتا ہے... غرض بچہ کیا ہے ایکٹر ہے... جادو کے دو خطوط تمہارے نام بھیج رہی ہوں۔ اس کی پیدائش ہی مجھے چند دنوں کی بات معلوم ہوتی ہے اور اب وہ خط بھی لکھنے لگا ہے۔ مجھے بڑی فاتحانہ مسرت ہوتی ہے، اس کی ذہانت اور اس کے دماغ کو دیکھ کر، میں نے تمہارا بہترین عنصر تم سے نچوڑ کر اپنا لیا ہے نا؟...'' وہ ایک خط میں جادو کے بڑے ہونے کے بعد جادو کے اسکول کے ایک ٹیچر کے حوالے سے اختر کو خط میں لکھتی ہیں کہ ''جب اسکول میں بچوں سے اپنے ملک کا جھنڈا بنانے کو کہا گیا تو جادو نے بجائے ترنگے کے لال جھنڈا ہتھوڑی اور درانتی کے ساتھ بنا دیا۔'' ان کے خطوط میں جگہ جگہ اس بات پر فخریہ جملے نظر آتے ہیں کہ جادو ابھی سے ترقی پسند اور کامریڈ ہے۔ وہ بڑے فخریہ انداز میں خط میں لکھتی ہیں کہ ''جادو اپنے دادا کا نام اسٹالن اور چچا کا نام غالب بتاتا ہے۔'' صفیہ کے یہ خطوط ایک ماں کی محبت اور اس کی فخریہ تربیت کے آئینہ دار ہیں۔ آج اس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ جاوید اختر ہندوستانی فلموں اور ادبی دنیا میں اپنا اور صفیہ کا جادو جگائے ہوئے ہیں۔ (23)

صفیہ سالم اپنی طالب علمی کے زمانے کے بارے میں بتاتی ہیں کہ ایم اے فائنل (معاشیات) میں مجھے ملا کر کل آٹھ اسٹوڈینٹس تھے..... یہ بات بھی اپنی جگہ دلچسپ ہے کہ اتنی پابندیوں کے باوجود ہم میں سے تین لڑکیوں کی شادیاں اپنے ڈپارٹمنٹ کے ساتھیوں سے ہوئیں اور در پردہ اپنی پسند کی۔ پسند کی ابتدا سیمینار کی کتابیں اور جرنلس کے مضامین کی آپس میں لین دین تھی، عشق و عاشقی کے رقعے پرچے نہیں۔ بہر حال محمود صاحب اور صفیہ آپا کی معرفت کئی سالوں بعد کلاس کی ذہنی رفاقت زندگی بھر کی رفاقت بن گئی۔ اسے میں علی گڑھ کا اپنے اوپر بہت

بڑا احسان سمجھتی ہوں۔

''روایاتِ علی گڑھ'' کے مصنف اور ہمارے مشفق و مہربان جناب محمد ذاکر علی خاں، بانی سر سید انجینیئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی یونیورسٹی کراچی (پاکستان) اپنی طالب علمی کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ہر علیگیرین کے چہرے پر خواہ وہ عمر کے کسی دور سے گذر رہا ہو، میرس روڈ کا نام سنتے ہی گلابی لہر دوڑ جاتی ہے اور وہ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتا ہے۔ سنہ و سال پس پشت ڈال کر اس کے دل و دماغ پر عالمِ جوانی چھا جاتا ہے۔ اس سڑک کا نام لو تو حریص ملاؤں کی طرح علیگیرینس کی نظروں میں حورانِ خلد کے مناظر آ جاتے ہیں۔ تاثرات سے مغلوب ہو کر شعرائے نے میرس روڈ کی شان میں قصیدے کہے ہیں۔ اتنا ہی نہیں اس سڑک سے گذرنے والی لاریوں اور تانگوں تک پر نظمیں کہہ ڈالیں جن میں نصف صدی گذر جانے کے باوجود آج بھی تازگی برقرار ہے۔

1950ء تک تو اس رہگزر حسیناں کی پرستش ہوا کرتی تھی، لیکن اب تو اس میرس روڈ کی شاخیں تمام یونیورسٹی میں پھیل چکی ہیں۔ 1950ء سے قبل البتہ سائنس، جغرافیہ اور بی ٹی کی طالبات کو درپردہ یونیورسٹی آنا ہوتا تھا، اس لئے مجنوں نکمّے ان سواریوں کے استقبال و مشایعت کو کلاس میں حاضر ہونے سے زیادہ مفید سمجھتے تھے۔ دیگر سب تعلیمی اداروں کی مثل علی گڑھ میں بھی ہر ذوق و فہم کے طالب علم ہوتے تھے۔ سب سے اعلیٰ قسم تو پڑھنے والوں کی ہوتی جو تن من دھن سے حصولِ علم کے درپے رہتے، پھر کھیلوں کے شائقین تھے جو کالج سے فارغ ہو کر کھیل کے میدانوں کا رخ کرتے۔ ایک طبقہ ہوسٹلوں میں ہی گزارنے کو مصرفِ تعلیم سمجھتا تھا لیکن بعض من چلے ایسے بھی تھے جو میرس روڈ کا طواف کئے بغیر زندگی کو بے مقصد تصور کرتے۔ یہ عاشق مزاج بن ٹھن کر شام کو میرس روڈ کا رخ کرتے اور ادھر ادھر سائیکلوں پر مارے مارے پھرتے لیکن جب ہاسٹل کو واپس آتے تو کچھ افسانے بھی سناتے جن میں زیادہ تر گھڑے ہوئے ہوتے۔

یہ لت ہمارے ایک کلاس فیلو کو بھی بحد منشیات پڑ گئی تھی۔ یہ حضرت ایک خاص تانگے کا پیچھا کیا کرتے تھے۔ لڑکیوں نے ان کی بے چارگی پر رحم کھاتے ہوئے ایک روز پرچہ تانگے سے گرا دیا ''ضروری کام ہے کل آیئے گا'' اس پر درج تھا، یہ اشارہ پا کر خوشی سے پھولے نہیں

سمائے۔ اگلے دن زیادہ ہی بن ٹھن کر پہنچے، لیکن تانگے کی طرف سے خاموشی رہی۔ دو تین روز بلکہ ہفتہ اسی طرح گزر گیا جس سے ان کی بے چینی میں اضافہ ہوتا رہا۔ آخر ساتویں روز معذرت نامہ مل گیا ''سہیلی نے پرچہ ڈالتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لئے خاموش رہنا پڑا۔ اب جیسے ہی موقعہ ملا لکھوں گی۔'' موصوف باہمت تھے، عشق کی آزمائش جھیلتے رہے۔ اسی طرح دن ہفتوں میں، ہفتے مہینے میں بدل گئے مگر متوقع نامۂ دوست نہیں ملا۔ تاہم انہوں نے امید کا دامن اور تانگے کا ساتھ نہ چھوڑا۔ خدا خدا کر کے یومِ قبولیت آ ہی گیا اور اس مرتبہ ایک نہایت رومانی وضع قطع کا لفافہ تانگے سے گرا۔ ہمارے دوست نے سائیکل سے اتر کر عالمِ شوق و گھبراہٹ میں اسے فوراً اٹھا لیا اور بجائے پڑھنے کے سینے سے لگا کر جیب میں رکھ لیا۔ حتیٰ کہ اپنے سائیکل سوار ساتھی کو بھی اس کی جھلک سے محروم رکھا۔ خلوت میں جب انہوں نے اس نامۂ یار کو بے چینی سے پڑھا تو اس میں درج تھا ''ارے نیولے... بہت وقت ضائع کر چکا ذرا جا کر آئینہ دیکھ اور اپنے بل میں واپس چلا جا۔'' اس ناکام عاشق کی داستان یا ''ایکیٹوٹی'' کی خبر بھی لڑکیوں نے اپنے کزن بھائیوں کے ذریعہ کالج تک پہنچا دی تا کہ اہلِ یونیورسٹی ''نیولے'' کو پہچان لیں اور اس نام کو مقبولیت حاصل ہو، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دیگر فالتو ناتجربہ کار ہوشیار ہو جائیں۔ بحمد اللہ چالیس کی دہائی کے یہ نیولے آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں لیکن چہرے کو ریشِ سفید نے مقدس بنا کر نیولے کو ڈھانپ لیا ہے اور وہ اب بجائے میرس روڈ کے چکر لگانے کے مسجد کا پنج وقتہ طواف کیا کرتے ہیں۔ گفتگو میں پری جمالوں کی جگہ بزرگانِ خوش خصال کا ذکر وردِ زبان رہتا ہے۔ اس صورتِ حال میں انہیں ''نیولا'' پکارتے ہوئے خوفِ خدا ہوتا ہے کہ اتنے برگزیدہ انسان کو نیولا کیونکر کہا جا سکتا ہے۔'' (24)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیمِ نسواں کو فروغ دینے اور ممتاز خواتین کا اپنے افکار و نظریات سے نوجوانوں کو روشناس کرانے کے لئے اسٹوڈینٹس یونین نے بھی قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ 1926ء میں اینی بیسنٹ کو طلبا یونین نے اپنے جلسہ میں مدعو کیا اور انہیں یونین کی لائف ممبر شپ کے اعزاز سے نوازا۔ ساتھ ہی ملک کی جنگِ آزادی میں حصہ لینے میں اپنے بھر پور تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ 1935ء میں ترکی کی خالدہ ادیب خانم کو بھی لائف ممبر شپ کے

اعزاز سے نوازا۔ بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو تو نہ جانے کتنی بار علی گڑھ آئی تھیں۔ مختار مسعود کا یہ کہنا کہ ''والدہ محترمہ نے ایک بار مسکراتے ہوئے کہا تھا'' یہ کافرہ کون ہے کہ جب جوان تھی تو باپ گرویدہ تھا اور بوڑھی ہوئی تو بیٹا شیدائی ہے۔''

مختار مسعود سروجنی نائیڈو کے 1948ء کے دورے کا حال قلم بند کرتے ہیں کہ ''یونین ہال اور اسٹریچی ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا جلسہ تھا۔ سال بھر پہلے اس بات کا تصور بھی ناممکن تھا کہ مسلم یونیورسٹی میں کسی کانگریسی ہندو لیڈر کو خوش آمدید کہا جا سکتا ہے۔ چند ہی ماہ میں نقشہ بالکل بدل گیا۔ برٹش انڈیا کی جگہ دو آزاد ملک وجود میں آ گئے۔ آزادی بڑی کافر صورت اور جان لیوا نکلی۔ بس غدر مچ گیا۔ سر کٹ گئے اور سامان لٹ گیا۔ لہٰذا لوگ بے سروسامان ہو گئے۔ مرنے والوں کو کسی نے دفن نہ کیا مگر بچ رہنے والے زندہ درگور ہو گئے۔ ہر شہر اور قریہ میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا مگر مسلم یونیورسٹی ابھی تک محفوظ تھی۔ پھر بری بری خبریں آنے لگیں۔ یونیورسٹی پر حملے کی تیاری ہو رہی ہے، قرب و جوار کے دیہات میں باقاعدہ تربیت دی جا رہی ہے، حملہ سخت اور کئی سمت سے ہوگا۔ ادھر یہ طے ہوا کہ حملے کی صورت میں عورتیں اور بچے سرسید ہال کی کشادہ اور محفوظ عمارت میں محصور ہو جائیں گے اور نوجوان باہر نکل کر مقابلہ کریں گے۔ کچھ ایسے انتظامات بھی کئے گئے کہ حملے کی اطلاع اگر ممکن ہو تو پہلے ہی مل جائے۔ بے چینی ضرور تھی مگر بے یقینی بالکل نہ تھی۔ لیکن جسے اللہ رکھے وہ اس ابتلا سے بھی بچ نکلتا ہے۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی بالکل محفوظ رہی۔ اس کی حفاظت کے سامان پیدا ہو گئے اور اسے نئے پاسبان میسر آ گئے۔ ان پاسبانوں میں سرفہرست سروجنی نائیڈو کا نام آتا ہے۔

سروجنی نائیڈو جب اسٹریچی ہال میں تقریر کرنے کے لئے کھڑی ہوئیں تو لوگوں کا خیال تھا کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی حفاظت کا رسمی اور مشروط اعلان کریں گی۔ سروجنی کے ساتھ گاندھی کیپ پہنے کچھ ہندو بھی آئے تھے جو پہلی صف میں بیٹھے تھے۔ ہر گاندھی ٹوپی سروجنی کو چیتاونی دے رہی تھی کہ مسلمان حریف ہیں اور ان سے برتاؤ بھی حریفانہ ہونا چاہئے۔ سروجنی نے تقریر شروع کی اور ان کے پہلے فقرے پر ہی سب لوگ چونک اٹھے۔ پہلی بات پوری ہوئی تو ہم لوگ دنگ رہ گئے اور سروجنی کے ساتھ آنے والوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔

کہنے لگیں ''میں آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کئی لوگوں کے مشورے کے خلاف اور چند لوگوں کی دھمکی کے باوجود حاضر ہوئی ہوں۔ مجھے علی گڑھ کی ضلعی اور یوپی کی صوبائی کانگریس نے پہلے مشورہ اور پھر حکم دیا کہ تم مسلم یونیورسٹی کا دورہ منسوخ کردو۔ وہ یہ بات بھول گئے کہ گورنر کی حیثیت سے میں اب کانگریس کی ممبر نہیں رہی۔ لہٰذا نہ ان کی رائے کی پابند ہوں نہ ان کے ضابطے سے مجبور اور میں کسی کی دھمکیوں کو کب خاطر میں لاتی ہوں۔ میں حاضر ہوگئی ہوں، بلبل کو چمن میں جانے سے بھلا کون روک سکتا ہے۔'' ہم نے بلبلِ ہند کی یہ بات سنی تو خدا کا شکر بجالائے۔

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

دس طویل مہینوں کے بعد سروجنی نائیڈو کی تقریر ہوئی۔ بے اعتباری کی فضا چھٹ گئی، علی گڑھ کو اس کا نیا مقام مل گیا۔ اب یہ سرسید کے علاوہ سروجنی کا علی گڑھ بھی ہے۔ کل نہ جانے یہ اور کس کس کا علی گڑھ ہو جائے گا۔ یہ تو دریا کی مانند ہے، بلند چوٹیوں سے چلا اور خشک صحرا کو سیراب کرتا ہوا سمندر کی جانب رواں ہے۔

سہ پہر کو طلبائے یونین ہال میں سروجنی نائیڈو کے اعزاز میں جلسہ تھا۔ میں نے اس جلسہ میں شرکت کی تو احساس کی شدت اور جذبات کی فراوانی کا عالم تھا۔ یہ جلسہ یونین ہال میں میرے طالب علمی کے دور کا آخری جلسہ ہوگا۔ اس کے چند دن بعد ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔ والدِ محترم نے اپنی جوانی کے بیس برس جنہیں وہ حاصل عمر کہتے ہیں اسی درس گاہ کی خدمت میں صرف کیے ہیں۔

میں یونین ہال میں پہلی بار تیسری جماعت کے بچے کی حیثیت سے والدہ محترمہ کے ساتھ داخل ہوا اور خواتین کی گیلری میں چق کے پیچھے بیٹھا۔ وہ 1935ء کی بات تھی آج 1948ء ہے اور میں ایم اے کا امتحان دے چکا ہوں۔ وہ یونین ہال میں میرا پہلا جلسہ تھا اور آج طالب علم کی حیثیت سے آخری بار شامل ہو رہا ہوں۔ اس روز کسی کی بات میری سمجھ میں نہ آئی اور آج میں لوگوں کو اپنی بات سمجھانے آیا ہوں۔ بھیڑ اس روز بھی تھی مگر والدہ محترمہ ہال میں بیٹھی تھیں۔

اس پہلے جلسہ کی طرح اس آخری جلسہ کی مہمانِ خصوصی بھی ایک عورت ہے۔ دونوں میں خوبیاں یکساں ہیں۔ صنف کی رعایت سے نازک اور صنف کی نسبت سے سخت کوشش اور سخت

جان۔ وہ خاتون بھی انقلابی اور جدیدیت پسند تھی اور یہ بھی۔ وہ تحریر میں منفرد یہ تقریر میں یکتا۔ وہ کوہ قاف کی پری تھی یہ گلشنِ ہند کی بلبل۔ اس کا نام خالدہ ادیب خانم تھا اور اس کا نام سروجنی نائیڈو ہے۔ ان دو ناموں کے درمیان بزم آرائی کی جو مسافت ہے وہ میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈینٹس یونین ہال میں طے کی تھی۔ آج جلسہ شروع ہوا تو ہمارے یہاں کوئی مجاز نہ تھا جو ''نذرِ خالدہ'' کی طرح ایک نظم ''نذرِ سروجنی'' کے عنوان سے لکھتا اور لہک لہک کر سناتا۔ لیکن مجاز کی نظم کے کتنے ہی ایسے شعر تھے جو سروجنی پر بھی صادق آتے ہیں۔ مجاز نے خالدہ ادیب خانم کے نطقِ گوہر بار اور فطرتِ احرار کا ذکر کیا، آزادی کے راز پوچھے، بیداری کا ساز چھیڑنے کی فرمائش کی، اس کی باتوں میں کوثر و تسنیم کا خمار دریافت کیا۔

سروجنی جب یونین ہال میں تقریر کے لئے کھڑی ہوئیں تو ان کی گل پاشی کی گئی۔ یونین ہال کی اس رسم کا جواب میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ بڑے بڑے ملکوں کے بڑے بڑے استقبال دیکھے، جاہ و حشم اور شان و شوکت کی کہیں کمی نہ تھی مگر پھر بھی جو حسن اور سادگی یونین ہال کی گل پاشی میں ہے اس کی یکتائی کو کوئی بھی نہ پہنچ سکا۔ یونین ہال میں ڈائس کے بالکل اوپر چھت میں ایک مستطیل شگاف ہے جس کے چاروں طرف روشن دان ہیں۔ اس چوکور سقفی روشن دان کے ارد گرد چھت پر گیندے کے سنہری پھولوں کی پتیاں منوں کے حساب سے ڈھیر کر لیتے ہیں۔ مہمانِ خصوصی جب تقریر کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو وہ عین اس شگاف کے نیچے ہوتا ہے۔ اس کی آمد پر تالیاں بجتی ہیں اور وہ خاموش کھڑا رہتا ہے۔ جوں ہی تالیاں مدھم ہوئیں اور وہ تقریر کرنے کے لئے تیار ہوا کہ اوپر سے پھولوں کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے تھوڑی اور پھر بہت سی پتیاں نیچے دھکیل دیتے ہیں، اس اونچائی سے فرش کی طرف اوپر تلے گرتے ہوئے پھولوں کی لرزش اور ریزش دیدنی ہوتی ہے، پہلے وہ مینھ کی بوندیں لگتی ہیں پھر آسمان سے زمین تک سہرے کی لڑیاں پروئی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں اچھے لوگوں پر نور برستا ہے، برستا ہوگا، مگر میں نے تو چند اچھے لوگوں پر عرش سے فرش تک بہار کو برستے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ وہ سماں بندھتا ہے کہ جس نے ایک بار پھولوں کی برسات دیکھی وہ تمام عمر اسے یاد رکھتا ہے اور جس پر ایک بار یوں گل پوشی ہو جائے وہ ساری عمر ان پھولوں کے نیچے دبا رہتا ہے۔

خالدہ ادیب خانم پر جب گل پوشی ہوئی تو وہ حیران ہو کر بار بار اوپر دیکھنے کی کوشش کرتیں کہ یہ پھول کہاں سے آرہے ہیں۔ مگر ہر بار پتیاں ان کی نظر اور ان کے چہرے کو ڈھک لیتیں۔ وہ اتنی متاثر ہوئیں کہ اس رسم کا ذکر اپنی کتاب میں بھی کیا جو برِ عظیم کے سفر کے بعد لکھی تھی۔ آج گل پوشی سروجنی پر ہوئی۔ دیکھنے والوں نے گل و بلبل کا نیا رشتہ بھی دیکھا۔ گل تھا کہ بلبل پر نثار ہو رہا تھا۔ بلبل کی باری آئی تو اس نے کہا "میں آج ایک طویل مدّت کے بعد یونین ہال میں آئی ہوں، پھولوں کی لڑیاں اور جوشیلے نوجوانوں کے جذبات کی کڑیاں ہی اس مدّت کے دونوں سروں کو آپس میں ملاتی ہیں۔ ہم نے پھول برسائے تھے سروجنی نے جواب میں موتی لٹانے شروع کر دیئے۔" (25)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اکیڈمک کلینڈر سے پتہ چلتا ہے کہ 1935ء میں یونیورسٹی کے اسکول میں مسز ڈنکن (Mrs.Duncan) آنریری لیڈی ٹیچر اور مس قمر جہاں جعفر علی جنہوں نے لندن سے مانٹیسری ڈپلوما کیا تھا، اسکول کے تدریسی عملے میں شامل ہو چکی تھیں۔ پروفیسر نسیم انصاری بھی اسی زمانے میں اس اسکول میں داخل ہوئے تھے وہ لکھتے ہیں "مس قمر جہاں اسکول کی نگراں تھیں۔ جب بڑے ہوئے تو انگریز خاتون مس ڈنکن سے انگریزی پڑھنا شروع کر دی۔ لڑکے لڑکیاں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ (26)

1935ء میں ہی یونیورسٹی کی سب سے اعلیٰ اختیاری مجلس، یونیورسٹی کورٹ کی رکن کی حیثیت سے تین خواتین۔ بیگم سر میاں محمد شفیع (لاہور)، بیگم صاحبہ سر سید امام علی (پٹنہ) اور ڈاکٹر (مس) نور جہاں، ایم اے پی ایچ ڈی، انسپکٹر آف اسکولس (شاہ جہاں پور) مردوں کے ساتھ ساتھ کورٹ کے اجلاس میں شریک ہوتی تھیں (27) مگر ملک کی آزادی سے پہلے تک یونیورسٹی میں لڑکیوں کو برقعہ پہننا لازمی تھا۔ قرۃ العین حیدر نے اس وقت کی صورتِ حال کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ "پھر میں ایم اے انگلش کے ارادے سے آئی۔ اس وقت لڑکیاں ایم اے کے لیکچر سننے کے لئے یونیورسٹی جانے لگی تھیں لیکن ان کو برقعہ اوڑھنا پڑتا تھا۔ اب میں ایم اے انگلش کی واحد لڑکی تھی۔ اب ایک فرد کے لئے کمرے میں اسکرین لگائی جائے یا کیا کیا جائے بڑا مسئلہ تھا۔ انگریز پروفیسر فیلڈن نے مجھ سے کہا اچھا میں بتاؤں تم برقعہ اوڑھ کر کلاس کے باہر دروازے

میں بیٹھ جایا کرنا۔ میں نے کہا کہ جناب شاید آپ سنجیدہ نہیں ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ برقعہ یہاں لازمی ہے۔ میں نے کہا کہ میری والدہ نے یہاں آکر 1920ء میں پردہ ترک کیا اور یونیورسٹی کے کئی اساتذہ کی بیگمات کو پردے سے باہر نکالا اور اب 25 سال بعد میں یہاں آکر برقعہ اوڑھوں۔ یہ ترقی معکوس مجھے منظور نہیں۔ چنانچہ علی گڑھ کو خدا حافظ کہا اور لکھنؤ چلی گئی۔

علی گڑھ کی سوسائٹی اس وقت تک اتنی ترقی پسند اور روشن خیال ہو چکی تھی کہ بڑی سے بڑی چونکا دینے والی تبدیلیوں کو بھی قبول کر رہی تھی۔ شیخ عبداللہ کی بیٹی خورشید مرزا 1939ء میں بمبئی ٹاکیز کی ہیروئن رینو کا دیوی بن گئیں تو مسلمانوں نے بطور احتجاج اپنی لڑکیوں کو گرلس کالج سے نہیں اٹھایا۔ چند سال بعد شیخ محمد عبداللہ کی بہو شاہدہ جنہوں نے محسن عبداللہ سے شادی کی تھی وہ بھی فلم اسٹار نینا بن گئیں۔ اس سے قبل علی گڑھ کی ایک اور لڑکی زبیدہ حق بطور بیگم پارہ فلموں میں داخل ہو چکی تھیں (28) اور ہندوستان کی پہلی بولتی فلم ''عالم آرا'' کی وہ ہیروئن تھیں جواب فلمی دنیا کی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ خورشید مرزا نے جیون پربت، بھابھی، نیا سنسار، سہارا، غلامی، سمراٹ چندر گپت جیسی فلموں میں اداکاری کی۔ ان کی پہلی فلم جب ریلیز ہوئی تو مسلم شریف گھرانوں کو فلم کے پردے پر رقص کرتے ہوئے جب لوگوں نے دیکھا تو شیخ عبداللہ کو مقامی اخبارات میں تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ ایک شادی شدہ لڑکی کی ذمہ داری والد پر نہیں بلکہ شوہر پر ہوتی ہے اور اپنی ماں کی ہدایت کی وجہ سے ان کا تعلق دو سال تک والدین اور خاندان کے دوسرے افراد سے منقطع ہو گیا۔ (29)

علی گڑھ کی ایک اور سابق طالبہ طاہرہ حسین لکھتی ہیں کہ ''یہ گھرانہ علی گڑھ کا تعلیم یافتہ نہایت ماڈرن گھرانہ تھا۔ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے فروغ کے لئے برِصغیر میں ان کی خدمات بے مثال ہیں مگر جب ان کی ایک صاحبزادی خورشید عبداللہ اور محسن عبداللہ نے فلم لائن اختیار کی اور وہ اپنی بیگم شاہدہ کو بھی لے گئے تو علی گڑھ کے معزز وضع دار گھرانوں نے اپنی بچیاں اس اسکول سے اٹھا لیں۔ خود ہماری بہنوں کے نام جو کہ برجیس اور خورشید تھے بدل دیے گئے اور ان کو اسکول سے اٹھا لیا گیا۔ مسلمان خاندان کی خواتین کے تعلیمی ارتقاء کے لئے یہ ایک بڑا Draw Back

تھا۔ خورشید عبداللہ نے رینو کا دیوی کے نام سے اور شاہدہ نے نینا کے نام سے فلمی دنیا میں خوب نام کمایا۔ ''من کی جیت'' اور ''دوسری شادی'' نینا کی مشہور فلمیں تھیں۔ بعد میں یہ لوگ پاکستان چلے گئے۔ خورشید آپا پاکستان ٹی وی کی اسکرین پر ''اکابوا'' کے نام سے مشہور ہوئیں اور عرصہ دراز تک پاکستان ٹیلیویژن پر کام کرتی رہیں۔ (1985ء میں انہیں پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیأالحق نے ٹی وی ڈرامہ کے شعبہ میں نمایاں کارکردگی کے اعتراف میں صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی سے نوازا تھا)۔ البتہ شاہدہ نے محسن عبداللہ سے طلاق لے کر مشہور فلم پروڈیوسر ڈبلیو زیڈ احمد سے شادی کر لی اور باقی زندگی گمنامی میں گزار دی۔''

محترمہ طاہرہ حسین نے لکھا ہے کہ ''ہمارے کالج کے زمانے میں جو مشہور ٹیچرس تھیں ان میں نفسیات کی مسز زہرہ ورما تھیں جن کی ایک صاحبزادی سریکھا ورما اب فلموں میں ماں کا رول کرتی نظر آتی ہیں۔ دوسری صاحبزادی پروین مراد تھیں جنہوں نے میڈیکل کی تعلیم حاصل کی اور مشہور فلم اسٹار نصیر الدین شاہ جو خود بھی علی گڑھ کے فارغ التحصیل ہیں سے شادی کی مگر افسوس یہ شادی کامیاب نہ ہو سکی اور ایک دن پروین مراد دسمبر کی کڑکڑاتی سردی میں میرس روڈ پر مردہ پائی گئیں۔ ان کے علاوہ انگریزی کی استاد شہناز ہاشمی بھی مشہور و معروف رہیں جو سعد ہاشمی کی بہن تھیں۔ رشید احمد صدیقی کی صاحبزادی سلمیٰ صدیقی بھی ہماری اردو کی استاد رہ چکی تھیں۔ ہمیں اردو غزل پڑھاتی تھیں مگر خود بھی مجسم غزل تھیں۔ ہم چونکہ اردو میں بہت اچھے تھے اس لئے ان کی گڈ بک میں شامل تھے۔ اس زمانے میں ان کی اپنے شوہر خورشید منیر سے علیحدگی اور معروف ترقی پسند افسانہ نگار کرشن چند سے وابستگی کی افواہیں گرم تھیں، ایک محفل میں اسرار الحق مجاز نے ترنگ کے عالم میں سلمیٰ آپا اور کرشن چند کی وابستگی کا پول کھولتے ہوئے بتایا کہ کرشن چند اور سلمیٰ کو پہلی بار دہلی میں انہوں نے ہی ملایا تھا اور پھر یہ ملاقاتیں رنگ لائیں۔ (30)

ملک کی آزادی کے بعد نہ صرف ہندوستان میں تعلیم نسواں کی فضا بدلی بلکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی علمی، ادبی اور ثقافتی زندگی میں نمایاں تبدیلیاں آنے لگیں۔ ویمنز کالج اب پوری طرح سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ہی ایک حصہ بن چکا تھا اور تعلیم نسواں کے فروغ کے امکانات بہت زیادہ روشن ہو گئے تھے۔ آزادی کے بعد سے یونیورسٹی اپنی تہذیبی سرگرمیوں کے لئے مشہور

ہوئی۔ لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ ڈراموں میں حصہ لیتے۔ یوتھ فیسٹیول میں بھی علی گڑھ کے طلباً اور طالبات اکٹھے اپنے پروگرام پیش کرتے، مشاعرے اور ادبی محفلوں میں دونوں برابر شریک ہوتے۔

1947ء کے بعد کی یونیورسٹی کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی پر پروفیسر اطہر صدیقی جو خود 1947ء میں اس ادارے کے طالب علم ہو گئے تھے۔ اپنی خودنوشت ''میں کیا مری حیات کیا'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ'' ہمارے ساتھ ایک ہی لڑکی مصطفےٰ بانو زبیری ہماری کلاس فیلو تھی۔ بانو سے بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی، اس کو زولوجی پڑھانے میں اس کے گھر جاتا تھا۔'' دسویں کلاس کی دو لڑکیوں صفیہ بی اور شوکت بی کا ذکر کرتے ہوئے وہ دل کی بات زبان پر لے ہی آتے ہیں'' اس ایک سال میں مجھے صفیہ بہت اچھی لگنے لگی تھی اور جتنا وقت ان کے ساتھ گزرتا وہ بہت اچھا لگتا تھا۔ غالباً میں بھی صفیہ کو اچھا لگتا تھا، لیکن علی گڑھ میں اس زمانے میں جو قدریں رائج تھیں اس کے مطابق کبھی ایک دوسرے سے اپنے دل کا حال کہنے کی ہمت نہ تھی، نہ سوال پیدا ہوتا تھا، صرف آنکھیں ہی دلوں کا حال ایک دوسرے سے کہہ سکتی ہوں لیکن زبان پر دل کا حال کبھی نہیں آیا۔ صفیہ کے لئے دل میں اس قدر پیار ہو گیا تھا کہ میں شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی ایک شعر کہہ بیٹھا جو مجھے آج تک یاد ہے۔'' انہوں نے یہ فیصلہ کر دیا کہ صفیہ بی پاکستان چلی جائیں اور مزید تعلیم وہاں حاصل کریں۔ میں صفیہ سے چلتے وقت کچھ نہیں کہہ سکا سوائے اس کے کہ میں نے ان کو وقتِ رخصت کوئی چھوٹا سا تحفہ ضرور دیا تھا اور انہوں نے اپنے ہاتھ کا کاڑھا ہوا ایک رومال مجھے دیا تھا۔ لیکن یہ سب چلتے وقت ہوا اور اتنی مہلت بھی نہ مل سکی کہ اس کے کوئی معنی نکالے جا سکتے یا کوئی بات ایک دوسرے سے کہی جا سکتی۔... صفیہ بی کی شادی تو 1954ء میں ہو ہی گئی تھی اور میری زندگی میں اب کوئی لڑکی نہیں تھی، ایک دو سے ملاقات ہوئی بھی تو وہ میری سمجھ میں نہیں آئیں۔''

پروفیسر اطہر صدیقی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اس بدلتے ہوئے مزاج پر مزید روشنی ڈالتے ہیں کہ'' ارشاد منزل میں جہاں محسن قریشی کے ساتھ عثمان (ادھمی) رہتے تھے، ویمنز کالج کی کچھ استانیاں جن میں کنیز فاطمہ، مسعودہ اور عابدہ شکور شامل تھیں شام کو روزانہ بیڈمنٹن کھیلنے آتی تھیں اور پڑوس میں ثریا سلطانہ وغیرہ بھی اس کلب کی ممبر ہو گئی تھیں۔ یہیں عثمان کی ملاقات مسعودہ سے پہلی بار ہوئی اور انہیں وہ بہت اچھی لگیں۔ ان کی یہ دلچسپی جلد ہی شدید محبت میں تبدیل

ہوگئی...اور وہ بھی اس حد تک کہ وہ اب کسی اور کی طرف دیکھنا یا اس کے متعلق گفتگو کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

عثمان کی ایک بہن ذکیہ ویمنز کالج میں بی اے کی طالبہ تھیں۔ایک دفعہ عثمان ان سے ملنے گئے اور اتفاق سے اسی روز میں بھی کسی سے ملنے وہاں گیا۔اسی وقت ذکیہ سلطانیہ ہاسٹل سے نکل کر اپنے بھائی سے ملنے پرووسٹ آفس کے سامنے پہنچیں۔عثمان نے مجھے ان سے ملوایا اور ذکیہ کو بتایا کہ میرے دوست ہیں اور شعبہ میں ساتھ کام کرتے ہیں۔ہم نے ایک دوسرے کو سلام کیا۔ذکیہ سے اس پہلی ملاقات کا منظر آج بھی یاد ہے۔15/جولائی 1956ء کو دونوں کی شادی ہوگئی۔ذکیہ ادھمی اب ذکیہ اطہر صدیقی بن گئیں۔(31) پروفیسر ذکیہ اطہر صدیقی کافی عرصہ ویمنز کالج کی پرنسپل بھی رہ چکی ہیں۔

قرۃ العین حیدر انہیں دنوں کے بارے میں لکھتی ہیں کہ"1956ء میں جب میں چند روز کے لئے علی گڑھ گئی تو اپنی کزن زہرہ آپا کے یہاں دیکھا کہ ایک سائیکل سوار لڑکی چلی آرہی ہے۔وہ میری ایک اور کزن تھی جو مجھ سے ملنے آئی تھی۔مجھے بہت اچھا لگا کہ یہاں لڑکیاں اب آزادی سے سائیکلوں پر گھوم رہی ہیں۔مزید تعجب اور خوشی تب ہوئی جب ایک ڈانس ماسٹر تشریف لائے اور انہوں نے میری کزن کی نوعمر لڑکی کو کتھک سکھانا شروع کیا۔صدر شعبۂ انگریزی محمود صاحب کی لڑکی انورہ کتھا کلی سیکھنے شانتی نکیتن گئی ہوئی تھی۔بھئی یہ علی گڑھ بالکل بدل گیا،کمال ہے۔" (32)

1950ء تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مرکزی ہال اسٹریچی ہال اور یونین ہال کے پروگراموں میں لڑکیاں اوپر بیٹھ کر جھرونکوں سے پروگرام سنا اور دیکھا کرتی تھیں مگر ذاکر حسین صاحب کی وائس چانسلر شپ میں ایم ایس سی فزکس کی طالبہ زہرہ نقوی پہلی ایسی طالبہ تھی جو اسٹوڈینٹس یونین کی کیبنیٹ ممبر چنی گئی۔زہرہ نقوی اپنی اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ بھی گئیں اور بعد میں خلائی سائنسداں بنیں اور اس طرح 1906ء میں لڑکیوں کو جس طرح پالکیوں میں بٹھا کر اسکول لایا جاتا تھا اب زہرہ نقوی جیسی سائنسداں خلاء میں اڑنے لگی۔بقول ڈاکٹر عبداللہ"جب میں شروع میں علی گڑھ آیا تھا یونیورسٹی میں زیادہ تر لڑکیاں برقعہ میں آتی تھیں۔کم لڑکیاں بے برقعہ ہوئی

تھیں۔ لیکن وقت کے ساتھ برقعہ بے برقعہ کا ریشو بالکل الٹ گیا تھا۔'' (33)

''1955-56ء میں زولوجی کے ایم ایس سی کے طالب علموں کا ٹور مدراس اور مانڈا پم لے کر جانا ہوا۔ یہ بھی ایک اچھا، دلچسپ اور انوکھا تجربہ تھا۔ اس گروپ میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل تھے۔'' (34)

1958ء کے تعلیمی سال میں یونیورسٹی میں طلبا اور طالبات کی مجموعی تعداد 4 ہزار 774 تھی جس میں ویمنس کالج میں پڑھنے والی طالبات کی تعداد 254 تھی اور گرلس ہائی اسکول میں 465 طالبات زیرِ تعلیم تھیں اور اس اسکول کا ہائی اسکول کا نتیجہ 94 فیصد تھا جب کہ ایس ٹی ہائی اسکول کا رزلٹ 83 فیصد رہا۔ 1958ء میں ہی ویمنس ہال کا نام بدل کر ''عبداللہ ہال'' کر دیا گیا تھا اور لڑکیوں کے لئے کھیل کود کا انتظام بھی شروع ہو گیا تھا۔ 18 سے 20ر دسمبر 1957ء میں ویمنس کالج نے اپنی گولڈن جبلی تقریبات بھی منعقد کیں جن میں ملک اور بیرونی ممالک سے اولڈ گرلس نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس موقعہ پر آرٹ نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں دو ہزار سے زائد لوگوں نے اس نمائش کو دیکھا۔ اسی سال ویمنس کالج کی پرنسپل پروفیسر مسز حیدر نے برطانیہ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں کی تعلیمی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے حکومتِ ہند کی مندوب کی حیثیت سے ان ممالک کا دورہ بھی کیا اور ان کی غیر موجودگی میں مس جوزف نے پرنسپل کی ذمہ داری سنبھالی۔ (35)

1960ء تک ہندوستان کی دوسری لڑکیوں کی طرح علی گڑھ کی لڑکیاں بھی روایتی تعلیم حاصل کر رہی تھیں مگر 1962ء میں جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج کے قیام کے بعد لڑکیاں ڈاکٹری کے پیشہ کی طرف متوجہ ہوئیں اور 1966ء میں جب ویمنس پالی ٹیکنک قائم ہوا تو لڑکیوں کا رجحان پیشہ وارانہ تعلیم کی طرف ہونے لگا۔ ویمنس پالی ٹیکنک میں جہاں کوسٹیوم ڈیزائننگ اور سکریٹریل پریکٹس کے ڈپلوما کورس چلتے ہیں وہیں الیکٹرونکس انجینیئرنگ، کمپیوٹر انجینیئرنگ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی جیسے کورسوں سے بھی لڑکیاں فائدہ اٹھا رہی ہیں۔

درس و تدریس کے علاوہ طلبا کی ادبی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لئے جنرل ایجوکیشن سینٹر اہم رول ادا کر رہا ہے جہاں طلبا اور طالبات ایک ساتھ ان پروگراموں

میں حصہ لیتے ہیں۔ قومی ترانہ اور مجاز کی تخلیق یونیورسٹی ترانہ ہر پروگرام میں پیش کئے جاتے ہیں تو لڑکیاں آگے کھڑی ہوتی ہیں اور لڑکے پیچھے۔ مجاز کے اسی ترانے نے لڑکیوں کو صفِ اول میں کھڑا کر دیا ہے۔ کینیڈی ہال ان ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا ہے جہاں ڈرامہ کلب، میوزک کلب، فلم کلب اور لٹریری کلب قائم ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وقت کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعلیم کا چلن عام ہوتا گیا اور لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعلیم کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ 67-1966ء میں یونیورسٹی سے ملحق سٹی ہائی اسکول، سیف الدین طاہر ہائی اسکول اور گرلس ہائی اسکول کے دسویں کلاس کے سالانہ نتائج کا جائزہ لینے پر پتہ چلتا ہے کہ گرلس ہائی اسکول کا رزلٹ سب سے زیادہ 95 فیصد رہا، دوسرے نمبر پر ایس ٹی ہائی اسکول کا 76 فیصد اور سٹی ہائی اسکول کا محض 41 فیصد تھا۔ اس وقت یونیورسٹی میں سات فیکلٹیاں تھیں۔ قانون فیکلٹی کو چھوڑ کر کوئی بھی ایسی فیکلٹی نہیں تھی جہاں طالبات نہ پڑھتی ہوں۔ بعض کورسوں میں تو لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ تھی۔ مثلاً بی اے (سال اول) میں لڑکوں کی تعداد 73 تھی اس کے برخلاف لڑکیوں کی تعداد 87 تھی۔ ایم ایڈ میں لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد برابر تھی۔ فیکلٹی آف آرٹس میں مجموعی تعداد 1,262 تھی جس میں لڑکوں کی تعداد 749 اور لڑکیوں کی 513 تھی، فیکلٹی آف سائنس میں کل تعداد 2,019 تھی جس میں لڑکوں کی تعداد 1,780 اور لڑکیوں کی تعداد 239 تھی۔ بی ایس سی انجینئیرنگ میں بھی چار لڑکیاں داخل ہو چکی تھیں جب کہ ایک لڑکی ایم ایس سی انجینئیرنگ کی طالبہ تھی۔ بی یو ایم ایس کے مقابلے میں ایم بی بی ایس میں اچھی خاصی طالبات تھیں۔ ایم بی بی ایس میں 226 کا اندراج تھا جس میں 167 لڑکے اور 59 لڑکیاں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ بی یو ایم ایس میں کل تعداد 197 میں سے 187 لڑکے اور 10 لڑکیاں تھیں۔ دینیات فیکلٹی میں کل آٹھ میں سے 12 لڑکے اور چھ لڑکیاں تھیں۔ اس طرح یونیورسٹی سطح کی تعلیم میں کل طلباً و طالبات کی تعداد 5 ہزار 961 تھی جس میں 835 لڑکیاں زیرِ تعلیم تھیں۔

رائفل شوٹنگ کے مقابلے میں مس عفت آراء زیدی کو وائس چانسلر پرائز سے بھی نوازا گیا تھا۔ اس طرح کھیل کود کے میدان میں بھی لڑکیاں اپنی موجودگی درج کرا رہی تھیں۔ یونیورسٹی

کے اقامتی ہالوں کی صفائی ستھرائی، غذائیت اور ڈائننگ ہال اور کچن کے نظم میں پرووسٹوں کی مدد کے لئے باقاعدہ ایک ویمنز وزیٹنگ کمیٹی بھی ہوا کرتی تھی جس میں چار خواتین ان اقامتی ہالوں کا نظم دیکھتیں۔ اس کمیٹی کی صدر مسز ضیاً الدین انصاری تھیں۔ دیگر ممبران میں بیگم جے پی سنگھل، بیگم جمال خواجہ، مسز زہرہ ورما اور اسسٹنٹ ڈی ایس ڈبلیو سکریٹری اور کنوینر کے فرائض انجام دیتے تھے۔ (36)

1972ء میں جب میرا داخلہ پری یونیورسٹی میں ہوا تھا اس وقت یونیورسٹی کیمپس میں ہر طرف ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ شام کو کھیل کے میدان بھی لڑکوں سے بھرے رہتے تھے اور طلباً اپنی اپنی پسند کے کھیلوں میں مصروف رہتے تھے۔ کیفے ڈی لیلیٰ اور کیفے ڈی پھوس پر عالمانہ گفتگو ہوتی تھی۔ اقامتی ہالوں کے سالانہ فنکشن کی تیاریاں بہت پہلے سے ہونے لگتی تھیں اور طلباً کو اپنے جوہر دکھانے اور شخصیت کو نکھارنے کے بھرپور مواقع فراہم کرائے جاتے تھے۔ میں این آر ایس سی کی طرف سے بیت بازی میں حصہ لیتا تھا اور اپنی طالب علمی کے زمانے میں مجھے کئی ہزار شعر یاد تھے۔ آخری بازی لڑکیاں ہی مار لے جاتی تھیں کیونکہ انہیں لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ شعر یاد ہوتے تھے۔

لڑکوں کے ہاسٹلوں میں عام حالات میں لڑکیوں کے آنے جانے پر پابندی تھی مگر ہال تقریب کے دوران یہ لڑکیاں برابر ہالوں کے مقابلوں میں حصہ لیتی تھیں۔ ریحانہ خسرو جواب فائن آرٹس شعبہ کی استاد ہیں وہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں اپنی آواز کا جادو جگاتی تھیں۔ بہت سی لڑکیاں ترنم سے غزلیں پڑھتی تھیں۔ کسی بھی فنکشن میں کسی بھی لڑکی کے ساتھ بدتمیزی تو بہت دور کوئی ہلکا سا جملہ بھی استعمال نہیں ہوتا تھا۔

لڑکیوں میں جیسے جیسے پیشہ ورانہ تعلیم کا چلن عام ہوتا گیا، اسی حساب سے یونیورسٹی انتظامیہ نے بھی ان کی طرف خاص توجہ کی۔ 1970ء تک لڑکیوں کے لئے صرف ایک اقامتی ہال عبداللہ تھا بعد میں سروجنی نائیڈو کے نام سے ایک نیا اقامتی ہال لڑکیوں کے لئے قائم کیا گیا جس میں ایم بی بی ایس، انجینیرنگ، ڈپلوما انجینیرنگ اور پوسٹ گریجویٹ طالبات کو اقامتی سہولت فراہم کرائی گئی۔ سروجنی نائیڈو ہال بھی جب ناکافی محسوس ہونے لگا تو جناب محمد نسیم فاروقی صاحب

کی وائس چانسلر شپ میں لال ڈگی روڈ پر کنکر والی کوٹھی کے نزدیک 1994ء میں نیو ہال فار گرلس قائم کیا گیا جس کا نام اندرا گاندھی ہال کردیا گیا اور اب لڑکیوں کا چوتھا اقامتی ہال بیگم سلطان جہاں قلعہ روڈ پر تعمیر ہو چکا ہے اور وائس چانسلر جناب نسیم احمد کا ایک اہم کارنامہ ہے موجودہ وائس چانسلر پروفیسر پی۔ کے عبدالنذیر نے انجینئرنگ کی طالبات کے لئے ایک علیحدہ ہاسٹل تعمیر کرانا شروع کردیا ہے۔

اس سے پہلے سید حامد صاحب کی وائس چانسلر شپ میں میڈیکل کالج ہسپتال میں نرسوں کا مسئلہ سنگین رخ اختیار کرنے لگا تھا۔ علی گڑھ میڈیکل کالج کی بہت سی نرسیں ملازمت کے لئے عرب ممالک جانے لگیں۔ ایسی صورت میں 1982ء میں میڈیکل کالج احاطہ میں ایک باقاعدہ اسکول آف نرسنگ شروع کیا گیا جس میں تین سال کا جنرل نرسنگ اور مڈوائفری کا ڈپلوما دیا جاتا ہے اور ان تربیت یافتہ نرسوں کو میڈیکل کالج میں ہی ملازمت مل جاتی ہے۔ 1982ء سے پہلے پورے میڈیکل کالج میں ایک بھی نرس مسلمان نظر نہیں آتی تھی۔ زیادہ تر کیرالا کی عیسائی نرسوں کی ہی حکمرانی تھی مگر اب وہاں بھی حالات بدل گئے ہیں۔

1978-79ء میں جب میں نے بی ایڈ میں داخلہ لیا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ ہماری کلاسیں یونیورسٹی میں نہ ہو کر ویمنس کالج میں ہو رہی ہوں۔ بی ایڈ میں ستّر فیصد تعداد لڑکیوں کی تھی اور پڑھانے والوں میں بھی بیشتر خواتین تھیں۔ ہماری استانیوں میں صفیہ آپا، غزالہ انصاری صاحبہ، مسز اویس اور پروفیسر ساجدہ زیدی صاحبہ تھیں۔ پروفیسر ساجدہ زیدی کلاس میں آنے سے پہلے سگریٹ جلاتی تھیں اور چار چھ کش لینے کے بعد ہی پڑھاتی تھیں۔ ان کی چھوٹی بہن پروفیسر زاہدہ زیدی نے ہمیں بی اے میں انگریزی پڑھائی تھی۔ وہ بھی اپنی بڑی بہن کی طرح سگریٹ کی ڈبی ہاتھوں میں رکھتی تھیں۔ زیدی سسٹرس کا شمار اس وقت یونیورسٹی کے ترقی پسند حلقہ میں ہوتا تھا۔ ان کی بڑی بہن صابرہ زیدی بھی شعبۂ تعلیمات کی استاد رہ چکی تھیں۔ ایم ایڈ کی تعلیم کے دوران بھی لڑکے اور لڑکیوں کا تقریباً یہی تناسب رہا۔

میرے طالب علمی کے زمانے میں لڑکیاں کھیل کود میں بھی حصہ لینے لگی تھیں۔ میری ایک کلاس فیلو یاسمین زیدی جو اردو کے مشہور ادیب علی جواد زیدی کی بیٹی تھی وہ روزانہ گھڑسواری

کرتی تھی۔ بعد میں پروفیسر نسیم انصاری کی بیٹی زویا انصاری تو رائڈنگ کلب کی کپتان بھی ہوگئی تھی۔ میکینیکل انجینیئرنگ کے استاد واسع عثمانی کی دونوں بیٹیاں بھی رائڈنگ کرتی تھیں اور گھڑ سواری کرتے ہوئے ان کی فوٹو انڈیا ٹوڈے کے سرورق کی زینت بھی بنی تھی۔ منٹو سرکل کی استانی خالدہ میڈم کی بیٹی صبا ناہید ڈرامہ کلب کی سرگرم رکن تھیں۔

1983-84ء کے تعلیمی سال میں یونیورسٹی میں کل طلباً وطالبات کا اندراج دس ہزار 588 تھا جس میں 8 ہزار 723 لڑکے اور ایک ہزار 865 لڑکیاں تھیں۔ اس وقت یونیورسٹی سے ملحق اسکولوں میں کل اندراج 5 ہزار 783 تھا جس میں اے ایم یو گرلس ہائی اسکول میں لڑکیوں کی تعداد 1659 تھی۔ یونیورسٹی میں اس وقت شعبہ جات کی تعداد 57 تھی جس میں سات شعبوں کی سربراہ خواتین تھیں۔ اسی سال عبداللہ ہال میں دوسو لڑکیوں کے ہاسٹل کی تعمیر کے لئے یو جی سی نے 69 لاکھ 72 ہزار پانچ سو روپیہ کی امداد فراہم کرائی تھی۔ مرکزی وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے مسز شیلا کول جن کے شوہر خود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے تھے، وہ بھی ویمنس کالج کی ایک تقریب میں شریک ہوئی تھیں۔ (37)

ستمبر 1984ء میں جب میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ رابطۂ عامّہ میں اپنی ملازمت اختیار کی اس وقت رجسٹرار آفس ایس ایس ہال میں ہوا کرتا تھا۔ وائس چانسلر کا دفتر اس جگہ تھا جہاں آج وکٹوریہ گیٹ کے برابر پرووسٹ آفس ہے۔ رجسٹرار آفس، فائینینس آفس اور دیگر دفاتر میں ایک بھی خاتون ملازم نہیں تھی مگر آج رجسٹرار آفس کا ایک بھی سیکشن ایسا نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی خاتون ملازم نہ ہو۔

جہاں تک ویمنس کالج کا تعلق ہے وہاں بھی لڑکیوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہو رہا ہے۔ نئے نئے کورس کھولے جا رہے ہیں۔ اب تک لڑکیوں کا یہ کالج صرف گریجویٹ سطح کی ہی تعلیم فراہم کرتا تھا مگر اب گزشتہ چند برسوں سے ایم ایس سی ہوم سائنس بھی شروع ہوگئی ہے۔ لڑکیوں کے لئے کالج کیمپس میں 1984ء سے کیریئر پلاننگ سینٹر بھی لڑکیوں کو اپنا کیریئر چننے اور بعض فنّی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لئے قلیل المدتی کورس چلا رہا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اس وقت 14 ممالک کی لڑکیاں بھی مختلف کورس کر رہی ہیں۔ اس کالج کے احاطہ میں سینئر

سیکنڈری اسکول (گرلس)، گرلس ہائی اسکول، عبداللہ نرسری اور پرائمری اسکول چلتے ہیں۔

سال 2003-2002ء کی سالانہ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ یونیورسٹی سطح پر لڑکے اور لڑکیوں کی کل تعداد 18580 تھی جس میں 12 ہزار 579 لڑکے اور چھ ہزار سے زائد لڑکیاں زیرِ تعلیم تھیں۔ یونیورسٹی سے ملحق اسکولوں کی تعداد اس میں شامل نہیں ہے۔ یونیورسٹی کے 87 رینک ہولڈرس میں لڑکیوں کی تعداد 48 تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یونیورسٹی میں لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں اور امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کرنے والوں میں بھی لڑکیوں کا تناسب زیادہ ہے۔ (38)

ویمنس کالج کی سابق پرنسپل پروفیسر ذکیہ اطہر صدیقی کی کوششوں سے 2001ء میں خواتین کا مطالعاتی مرکز بھی قائم ہوگیا ہے۔ یہ سینٹر سوشل سائنس فیکلٹی کا ایک حصہ ہے اور بی اے سطح پر ویمنس اسٹڈی کا ایک کورس بھی شروع کیا گیا ہے۔ ملک بھر میں اس طرح کے 72 مراکز یو جی سی کی امداد سے مختلف یونیورسٹیوں میں قائم ہو چکے ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹ بابت 2005 - 2004ء سے پتہ چلتا ہے کہ یونیورسٹی اور اس سے ملحق اسکولوں کو ملا کر 27 ہزار 273 طلباً اور طالبات زیرِ تعلیم تھے جس میں 16 ہزار 267 لڑکے اور دس ہزار چھ لڑکیاں تھیں۔ اس طرح لڑکیوں کا تناسب 35 فیصد سے زائد تھا۔ ایم فل میں 54 میں سے 24 کا تعلق صنفِ نازک سے تھا اور یونیورسٹی کی بارہ فیکلٹیوں میں سے چار فیکلٹیوں کی ڈین خواتین تھیں۔ ان میں آرٹس فیکلٹی کی ڈین پروفیسر آزرمی دخت صفوی، سوشل سائنس کی ڈین پروفیسر شیریں موسوی، یونانی میڈیسن کی ڈین پروفیسر قمر اختر کاظمی اور میڈیسن فیکلٹی کی ڈین پروفیسر شمیم جہاں رضوی تھیں جب کہ اسی سال دلّی یونیورسٹی جیسی عظیم یونیورسٹی میں ایک بھی ڈین خاتون نہیں تھی۔ (39)

غرض کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اپنے قیام سے لے کر آج تک کسی بھی لڑکی کے ساتھ کسی بھی طرح کا امتیاز نہیں برتا جاتا بلکہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی زیادہ حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کیونکہ وہ لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ مہذب، شائستہ اور لائق ہوتی ہیں... لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کا تعلیمی معیار بھی بلند ہے۔ دوسری سب سے اہم وجہ علی گڑھ کا ماحول بھی ہے جہاں

لڑکیوں کو جدید تعلیم کے مواقع فراہم ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ یہاں مشرقی ماحول ہے...یہی وجہ ہے کہ والدین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو تعلیمِ نسواں کے لحاظ سے سب سے زیادہ محفوظ جگہ تصور کرتے ہیں جب کہ ملک کی راجدھانی دلّی لڑکیوں کے لئے آج سب سے زیادہ غیر محفوظ بن گئی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا نمایاں وصف اور قابلِ لحاظ کارنامہ یہ ہے کہ شروع سے اب تک بہ حیثیت مجموعی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت جس نہج پر ہو رہی ہے وہ نہ تو محدود جامد قدیم نوعیت کا ہے اور نہ غیر محدود آزادی، بلکہ ان کی ساخت برداخت اور ذہنی و اخلاقی نشو و نما مسلمہ اقدار و روایات کے ماتحت ہو رہی ہے تا کہ ہماری لڑکیاں قدیم و جدید کے صالح عناصر سے آشنا و ہم آہنگ رہیں۔ گزشتہ پچاس برس کے اعداد و شمار کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ 2015ء تک مسلم یونیورسٹی میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ ہو جائے گی۔ 2020ء میں جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اپنے قیام کی صد سالہ تقریبات منائی جائیں گی تو اس وقت اس کا بھی امکان ہے کہ نسوائی تحریک اپنے پورے عروج پر ہوگی اور ایک مسلم ویمنس یونیورسٹی کے قیام کے لئے علیگ برادری کی طرف سے مطالبہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اپنی 33 سالہ وابستگی کی بنا پر میں پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ صرف دو تین مبیّنہ واقعات اور حادثات کو چھوڑ کر علی گڑھ کی پوری فضا ہر طرح کی آلودگی سے پاک رہی۔ سوائے شعبۂ صحافت کی ایک طالبہ جس نے اپنی ذاتی غرض کی وجہ سے نہ صرف اس ادارے کا تقدس پامال کرنے کی کوشش کی بلکہ علی گڑھ سے باہر کی دنیا کو یہ تاثر دینے کی مذموم حرکت کی کہ علی گڑھ کی لڑکیوں کو قید کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور لڑکیوں کے لئے یہاں ڈریس کوڈ نافذ ہے تا کہ علی گڑھ کا رشتہ عہدِ وسطیٰ سے قائم ہو جائے۔ جس دن ان صاحبزادی نے ہنگامہ رچا۔ اتفاق سے 2 رفروری کا دن علی گڑھ کی تعلیمِ نسواں کی تاریخ میں ایک یادگاری دن ہے اور اسی دن ویمنس کالج میں ''یومِ بانیان'' کا جلسہ بڑے اہتمام سے منعقد کیا جاتا ہے۔ اس لڑکی نے شیخ عبداللہ (پاپا میاں) کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے بجائے دیدہ و دانستہ ایک سازش کے تحت اپنی مادرِ علی گڑھ کو زک پہنچانے کی کوشش کی۔

اسی طرح کی گھناؤنی حرکت شعبۂ قانون کی ایک طالبہ بھی کرتی رہتی تھی۔ کبھی انٹرنیٹ

پر تو کبھی انگریزی رسائل میں مضمون لکھ کر یونیورسٹی کو بدنام کرنے کی نئی نئی سازشیں کرتی رہتی۔ اس طالبہ کی امریکہ کی ایک تنظیم سے بھی وابستگی تھی۔

اس سلسلے میں شعبۂ کیمیا کے ریٹائرڈ پروفیسر فصیح احمد صدیقی کا یہ قول نقل کرتا ہوں ''خواتین کا احترام علی گڑھ کے طلباً کے مذہب کا جزو ہی نہیں جزو اعظم ہے۔ کسی طرح کی بی گریڈ کی بات برداشت نہیں کی جاسکتی۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے 45 برسوں میں سڑک پر، لائبریری میں، کیفے ٹیریا میں، کلاس روم میں غرض کہ علی گڑھ میں کسی وقت کسی طالب علم کے منھ سے ہلکا جملہ نہ سنا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک بار ایک واقعہ ڈپارٹمنٹ آف کیمسٹری میں میرے سامنے ہوا۔ ڈپارٹمنٹ میں کم از کم ایک تہائی تعداد ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی میں لڑکیوں کی ہوا کرتی ہے۔ بایو کیمسٹری میں تو ایک بار تین چوتھائی لڑکیاں ہی تھیں۔ ہاں تو ایک دن صبح سے ہی سارے کے سارے موجود، شام ہوگئی، بارش رکنے کا نام کسی صورت سے نہ لے، سڑکوں پر گھٹنوں گھٹنوں پانی ٹھہر گیا۔ ادھر تو ڈپارٹمنٹ میں لڑکیاں اس طرح نہایت اطمینان کے ساتھ ہنستی بولتی، قہقہہ لگاتی رہیں جیسے اپنے گھر میں ہوں۔ رات ہونے لگی، اب کچھ پانی رکا، لڑکے دوڑ دوڑ کر رکشے لاتے رہے اور اپنی سائکلوں پر دو دو طالب علم بیٹھ کر ہر لڑکی کو اس کے گھر یا ہاسٹل پہنچا آئے۔ تیسرے روز لڑکیوں کے والدین ڈپارٹمنٹ میں شکریہ ادا کرنے آئے۔

کچھ یونیورسٹیوں کا مجھے بھی تجربہ ہے، ذرا لڑکوں کے ہاسٹل کے قریب کی سڑک سے کوئی لڑکی رکشے میں جاکر تو دیکھے۔ کانوں میں وہ آوازیں پڑتی ہیں کہ شیطان بھی شرما جائے۔ ایک بار میرے استادِ محترم پروفیسر آر پی رستوگی پی ایچ ڈی Viva لینے تشریف لائے۔ ان کا لیکچر بھی ساتھ ہی تھا۔ لیکچر کے بعد ایم ایس سی کے طالب علم اور طالبات نے ناشتے کا انتظام کیا۔ ایسا مثالی ڈسپلن دیکھ کر ہمارے پروفیسر رستوگی صاحب دم بخود رہ گئے۔ حیرت زدہ رستوگی صاحب بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور ہندوستان کے پائے کے سائنٹسٹ، لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ فرمانے لگے کہ مسلم تہذیب کی بات ہی دوسری ہے۔ پھر یہ بھی کہا کہ علی گڑھ میں عام طور سے اپر کلاس کے طالب علم آتے ہیں اور شرافت میں ان کا جواب نہیں۔ جی خوش ہوگیا یہ سن کر۔ میں نے بس یہی کہا کہ علی گڑھ سے زیادہ صاف ستھری، پاک وصاف جگہ لڑکیوں کے لئے

خصوصاً شاید کسی دوسری یونیورسٹی میں نظر نہ آئے، چاہے آکسفورڈ ہو یا کیمبرج یا ہارورڈ۔ رستوگی صاحب نے اس بات کو مانا۔" (40)

ایک صدی قبل اس ادارے کی طالبات کو اپنی تعلیم حاصل کرنے کے لئے سخت چیلنجوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا مگر آج زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تربیت یافتہ لڑکیوں نے اپنی موجودگی درج نہ کرائی ہو۔ آج علی گڑھ کی پڑھی ہوئی لڑکیاں ڈاکٹر ہیں، انجینیئر ہیں، وکیل ہیں، ادیب اور صحافی ہیں، سائنسداں ہیں اور سب سے زیادہ یونیورسٹیوں میں پروفیسرس ہیں۔

ادب کے میدان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بانی ڈاکٹر رشید جہاں، ممتاز ناول نگار عصمت چغتائی، تسنیم سلیم چھتاری، ممتاز ادیبہ کسم انسل، صفیہ جاں نثار، سلمیٰ صدیقی، پرنٹ اور الیکٹرونکس میڈیا کے میدان میں منجری مشرا و کلپنا جین (ٹائمز آف انڈیا) رعنا افروز صدیقی (دی ہندو) سلمیٰ زیدی (بی بی سی) عارفہ خانم (این ڈی ٹی وی) رومانہ خان (سہارا سمے) پونم شرما (آج تک) خدیجہ عظیم، نازش حسینی، پربھا گپتا، صبا زیدی، سندھیا جلال، شاہدہ باسو، طاہرہ نیازی۔

فلم کی دنیا میں ہندوستان کی پہلی بولتی فلم "عالم آرا" کی ہیروئن بیگم پارہ، رینوکا دیوی، نینا، سریکھا سیکری رینگے، نگار سلطانہ اور تبسم۔ پاکستان میں 250 سے زائد فلموں میں کام کرنے والی ملکۂ جذبات نیر سلطانہ کا بھی علی گڑھ سے تعلق رہ چکا ہے۔

تعلیم کے میدان میں مرانڈا کالج کی ڈاکٹر کرن داتار، آکسفورڈ یونیورسٹی کی پروفیسر فرح نظامی، پریسٹن یونیورسٹی امریکہ کی پروفیسر فیروزہ احمد، میڈیسن یونیورسٹی امریکہ کی پروفیسر یاسمین سیکیا، ہندوستان میں پہلی مسلم ایف این اے پروفیسر قمر رحمٰن، امریکہ کی اسپیس سائنٹسٹ پروفیسر ظہرہ نقوی، قومی اقلیتی کمیشن کی رکن اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں پروفیسر زویا حسن، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی رکن پروفیسر حمیدہ احمد کے نام شامل ہیں۔

سماجی خدمت اور سیاست کے میدان میں محترمہ محسنہ قدوائی (سابق مرکزی وزیر) محترمہ انورہ تیمور (سابق وزیر اعلیٰ آسام) سابق صدر جمہوریۂ ہند جناب فخر الدین علی احمد کی بیگم عابدہ احمد (سابق ایم پی) بھی اسی ادارے کی طالبہ رہیں۔

حواشی

1۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ: 30 ر مارچ 1886ء

2۔ ایضاً 15 ر مئی 1912ء

3۔ بیگم خدیو جنگ: الناظر جولائی 1911ء۔ صفحہ 46-45۔ تعلیمی ادارے، خدابخش لائبریری، پٹنہ

4۔ شیخ محمد عبداللہ: سوانح عمری عبداللہ بیگم، صفحہ 16، عبداللہ لاج، علی گڑھ

5۔ ایضاً صفحہ 22

6۔ ایضاً صفحہ 23

7۔ فرح نظامی: زنانہ نارمل اسکول سے مسلم گرلس ڈگری کالج تک۔ صفحہ 159-158 ''خواتین نمبر'' علی گڑھ میگزین 2001ء

8۔ پروفیسر اصغر عباس: سرسید تحریک کی نسائی جہت۔ صفحہ 30

9۔ ثریا حسین: یلدرم آزادیٔ نسواں کا ایک علمبردار۔ صفحہ 53-52 ۔ مجموعہ مقالات یلدرم سیمینار، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

10۔ بیگم ساجدہ زبیر: ویمنز کالج کا پس منظر۔ صفحہ 679 علی گڑھ میرا چمن، باب العلم پبلی کیشن ،بھوپال 2001ء

11۔ طارق حسن: علی گڑھ موومینٹ ۔ رویا پبلی کیشن، نئی دلّی

12۔ ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین: ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ۔ صفحہ 162-161

13۔ بیگم ساجدہ زبیر: ویمنز کالج کا پس منظر۔ صفحہ 679۔ ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ 1990ء

14۔ وارث علوی: دیباچہ ''کاغذی ہے پیرہن'' صفحہ 16 ۔ پبلی کیشن ڈویژن، حکومتِ ہند

15۔ عصمت چغتائی: کاغذی ہے پیرہن۔ صفحہ 149-148

16۔ شان محمد: گلمپسیز آف مسلم ایجوکیشن ان انڈیا۔ صفحہ 3 انمول پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ ۔

نئی دلی 2006ء

17۔ یونیورسٹی کلینڈر: 1932ء

18۔ ایضاً صفحہ 23

19۔ قرۃ العین حیدر: شاہراہِ حریر۔ صفحہ 280، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی

20۔ علی سردار جعفری: پتھر کے شگاف۔ صفحہ 121 یادیں نمبر، آفتاب ہال میگزین، اے ایم یو 1976ء

21۔ حمیدہ اختر حسین: ہم سفر۔ صفحہ 37-36، مکتبہ دانیال، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی

22۔ حمیدہ سالم: ہم ساتھ تھے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلی 1991ء

23۔ ڈاکٹر جمال حسین قادری: صفیہ اختر کا علی گڑھ۔ سر سید ڈے میگزین 2002ء نورتھ کیلی فورنیا

24۔ ذاکر علی خاں: رہگذر فردوس۔ سر سید ڈے میگزین 2001ء نورتھ کیلی فورنیا

25۔ مختار مسعود: آوازِ دوست۔ صفحہ 193-181، حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدر آباد 1987ء

26۔ پروفیسر نسیم انصاری: زادِ راہ۔ صفحہ 45 ماہنامہ تہذیب، کراچی۔ دسمبر 2004ء
جلد 21 شمارہ 12

27۔ یونیورسٹی کلینڈر: 1935ء

28۔ قرۃ العین حیدر: شاہراہِ حریر۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی

29۔ لبنیٰ کاظم: اے ویمن آف سبسٹینس۔ صفحہ 138، زبان حوض خاص۔ نئی دلی

30۔ طاہرہ حسین: نذرِ علی گڑھ۔ سر سید ڈے میگزین 2002ء ۔ امریکہ

31۔ اطہر صدیقی: میں کیا مری حیات کیا۔ صفحہ 97-96، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 2003ء

32۔ قرۃ العین حیدر: شاہراہِ حریر۔ صفحہ 165

33۔ ڈاکٹر عبداللہ: کچھ یادیں کچھ باتیں، سر سید ڈے میگزین 2002ء

34۔ اطہر صدیقی: میں کیا مری حیات کیا۔ صفحہ 89

35۔ سالانہ رپورٹ ...... 1958ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

36۔ سالانہ رپورٹ 67 - 1966ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

37۔ سالانہ رپورٹ 84 - 1983ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ